Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1977

اس پرچہ میں :

۱ ۔ شہدائے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یاد میں ۔

۲ ۔ قرآنی آئین کے بنیادی خط و خال ۔

۳ ۔ پاکستان میں اسلامی قانون کیسے بن سکے گا ؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ ۔ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلیفون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ۔ ۔ ۔/۱۸ روپے غیر ممالک ۔ ۔ ۔ ۳ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۳۰	ستمبر ۱۹۷۷ء	شمارہ ۹

فہرست

۱ - لمعات ۲
۲ - قرآنی آئین کے بنیادی خط و خال ۹
۳ - پاکستان میں اسلامی قانون کیسے بن سکے گا؟ ۲۵
۴ - حقائق و عبر .. .. .. (۱) نظامِ مصطفٰےؐ کیا ہے؟ .. .. .. } ۳۵
(۲) مذہبی آزادی .. .. }
۵ - باب المراسلات .. .. (ٹی - وی پر قرآنی آواز) ۳۸
۶ - شہدائے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یاد میں .. .. (محترم پرویز صاحب) ۴۱
۷ - میراث کے متعلق ایک اہم سوال ۵۷
۸ - طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۷ء ۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس کا ہسپتال روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

یہ شکایت آج کی نہیں، صدیوں سے چلی آ رہی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے ـــــ کسی خاص فرقہ۔ خاص گروہ۔ خاص ملک کے مسلمانوں نے نہیں۔ پوری کی پوری اُمتِ مسلمہ نے۔ بات ہے تو درست، لیکن سوال یہ ہے کہ کبھی کسی نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ کیا ہوا کہ پوری کی پوری قوم نے اسلام چھوڑ دیا۔ اور یہ ایک آدھ دن کی بات نہیں۔ صدیوں سے اس کی یہی حالت ہے۔ تو ایسا کیوں ہے؟ ایک بات تو بالکل واضح ہے ـــــ پہلے اسی پر غور کرنا چاہیئے۔

آپ کسی کمیونسٹ سے پوچھئے کہ کمیونزم کسے کہتے ہیں۔ وہ صاف، واضح اور متعین الفاظ میں اس کا جواب دے دے گا ـــــ آپ یہ سوال متعدد کمیونسٹوں سے پوچھئے۔ ہر ایک کا جواب ایک ہی ہوگا۔ اس جواب کی روشنی میں آپ کے لئے یہ متعین کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا کہ فلاں شخص کمیونسٹ ہے۔ یا نہیں۔ یا فلاں قوم نے کمیونزم کو چھوڑ دیا ہے یا وہ اس پر عمل پیرا ہے۔

اسی طرح آپ سوشلسٹوں سے، سوشلزم کے متعلق پوچھئے۔ ان کے ہاں سے بھی متعین جواب مل جائے گا کہ سوشلزم کسے کہتے ہیں اور اس کے جواب کی روشنی میں آپ بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ فلاں شخص یا قوم نے سوشلزم کو چھوڑ دیا ہے یا نہیں؟

اسی قسم کا سوال آپ مغربی جمہوریت کے متعلق پوچھئے۔ وہاں سے بھی آپ کو متعین جواب مل جائے گا۔

اس کے بعد آپ کسی مسلمان سے پوچھئے کہ اسلام کیا ہے اور پھر دیکھئے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے؟ اور جب آپ یہی سوال مختلف مسلمانوں سے پوچھیں تو اس کے بعد دیکھئے کہ ان میں سے ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملے گا۔ یہ بات ہم عوام کے متعلق نہیں کر رہے۔ حضرات علماء کرام سے یہ سوال کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان کے ہاں سے کیا جواب ملتا ہے، اور ایک کا جواب دوسرے سے کس قدر مختلف ہوتا ہے۔ ہم یہ بات محض نظری طور پر نہیں کہہ رہے۔ عملاً ایسا ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۳ء کے

(ختم نبوت تحریک کے سلسلہ میں) سادات پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی نے (جسے عرفِ عام میں منیر کمیٹی کہا جاتا ہے) مختلف علماء کرام سے پوچھا کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں"۔ کمیٹی کی رپورٹ مطبوعہ شکل میں موجود ہے اس میں آپ دیکھئے کہ ان حضرات کی طرف سے اس سوال کا جواب کیا ملا تھا! ان میں سے بعض نے تو کہہ دیا کہ اس سوال کا جواب دو چار فقروں میں دیا نہیں جا سکتا۔ اس کے لئے صفحات در صفحات درکار ہوں گے، جنہوں نے جواب دیا۔ ان کے متعلق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:-

ان علماء میں سے کسی دو کے جواب بھی ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے۔

(انگریزی رپورٹ۔ صفحہ ۲۱۸)

آپ اس رپورٹ پر نہ جائیے۔ مختلف فرقوں کے علماء حضرات سے خود یہ سوال پوچھئے کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور مسلمان کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے۔ ان کے جواب خود اس رپورٹ کی تائید کر دیں گے۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ سوچئے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے، تو اس کا متعین مفہوم کیا ہے؟ جب ہم متعین اور متفق طور پر یہی نہیں بتا سکتے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں اور اسلام کیا ہے تو ایسا کہنے کا مفہوم کیا ہوگا کہ "مسلمانوں نے اسلام چھوڑ دیا ہے"۔ یہ وجہ ہے جو ہم صدیوں سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اسلام چھوڑ دیا ہے اور مسلمان ہیں کہ اسلام کو اختیار کرنے کا سوچتے تک نہیں۔ یہ اس لئے کہ انہیں پتہ ہی نہیں کہ انہوں نے کیا چھوڑ دیا ہے اور انہیں کیا اختیار کرنا چاہیئے۔ ہم اتنا واضح کر دیں کہ مختلف فرقے اپنے اپنے فرقہ کے تصور کا اسلام تو بتا دیں گے۔ لیکن وہ اسلام جو ساری اُمت میں قدرِ مشترک ہے، جس کی طرف نسبت سے وہ اُمت، اُمتِ مسلمہ کہلاتی ہے اور جس کے متعلق شکایت ہے کہ اس نے اسے چھوڑ دیا ہے، اس کی بابت کوئی کچھ نہیں بتا سکے گا کہ وہ ہے کیا؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر، اور تو اور، آپ خود بھی وقفِ تعجب ہو جائیں گے کہ جس بات کے متعلق کبھی ہم نے اتنا سوچنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ یہ بھی ایسا سوال ہے جس پر غور کرنا چاہیئے، وہ بات کس قدر اہم اور بنیادی نکلی۔ اس کے بعد آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہم تو خیر عامی ہیں۔ دین کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں، اس لئے ہم اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ لیکن ہمارے علماء کرام کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بھی اس سوال کا متفق علیہ جواب نہیں دے سکتے۔ اور جب ان کی یہ کیفیت ہے تو پھر وہ اُمت میں اپنی موجودہ پوزیشن کو کس طرح قائم رکھے ہوئے ہیں اور لوگوں کو اسلام کے متعلق مطمئن کس طرح کر دیتے ہیں؟

اس کی ایک خاص ٹیکنیک ہے۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے کچھ اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں جن کا تقدس عوام کے دلوں میں راسخ کر دیتے ہیں۔ ان اصطلاحات کو مبہم رکھا جاتا ہے۔ یعنی ان کا واضح مفہوم بیان نہیں کیا جاتا۔ ہر موقعہ پر اس اصطلاح کو استعمال کر دیتے ہیں اور بس ــــ مثلاً ان میں بنیادی اصطلاح خود اسلام ہے۔ آپ آئے دن ان حضرات کی زبان سے اس قسم کے الفاظ سنتے

رہتے ہیں کہ "اسلام کا حکم یہ ہے"۔ اس معاملہ میں "اسلام کا منشاء یہ ہے"۔ اس باب میں "اسلام یہ کہتا ہے"۔ اب ظاہر ہے کہ "اسلام" کسی شخص کا تو نام نہیں جس کے متعلق سمجھا جا سکے کہ وہ ایسا کہتا ہے یا اس کا حکم یہ ہے۔ اس کے لئے کوئی سند یا حوالہ ہونا چاہیئے جہاں سے معلوم ہو سکے کہ کون ایسا کہتا ہے۔ یہ کس کا حکم ہے۔ لیکن یہ حضرات کبھی حوالہ نہیں دیں گے، اسے ہمیشہ مبہم رکھیں گے۔ اس لئے کہ جب یہ کہیں گے کہ "اسلام کا یہ فیصلہ ہے" تو اکثر و بیشتر یہ فیصلہ ان کا اپنا ہوگا جسے یہ اسلام کا فیصلہ کہہ کر پیش کر دیں گے۔ اور یا ان کے فرقہ کا فیصلہ۔ اب ظاہر ہے کہ کسی فرقہ کا فیصلہ تو اسلام کا فیصلہ نہیں کہلا سکتا۔ لیکن یہ اسے دانستہ مبہم رکھیں گے۔

اس قسم کی ایک اصطلاح ہے "اسلامی شریعت" یا "شریعتِ حقہ"۔ آئے دن اس قسم کے الفاظ سننے میں آتے ہیں کہ شریعت کا یہ حکم ہے۔ شریعت کا یہ فیصلہ ہے۔ یہ از روئے شریعت ناجائز ہے۔ آپ دل میں سمجھتے ہوں گے کہ یہ اسلام کا فیصلہ ہے۔ لیکن یہ بھی درحقیقت کسی فرقہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر فرقہ کی شریعت الگ الگ ہے۔ جسے آپ "اسلام کی شریعت" کہیں گے ـــــ یعنی وہ شریعت جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کریں، اس کا کہیں وجود نہیں۔

ایک اصطلاح "سنتِ رسول اللہ" ہے۔ اس کے متعلق تو آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ تمام مسلمانوں میں متفقہ علیہ ہوگی کیونکہ حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی تو ایک ہی تھی اس لئے حضورؐ کی سنت بھی ایک ہی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں۔ سنتِ رسول اللہ بھی ہر فرقہ کی الگ الگ ہے۔ حتیٰ کہ "سنت" کی تعریف (DEFINITION) تک بھی مختلف۔

یہ (اور اسی قسم کی کئی ایک اور) اصطلاحات ہمارے ہاں صدیوں سے رائج چلی آ رہی ہیں۔ لیکن ہمارے زمانے میں چونکہ سیاست کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے اس لئے اب قدیم اصطلاحات کے بجائے، جن کا تعلق "مذہب" سے سمجھا جاتا ہے، نئی نئی اصطلاحات وضع کی جا رہی ہیں۔ ان میں ایک اصطلاح "اقامتِ دین" ہے۔ اس اصطلاح کی پبلسٹی تو بہت زیادہ ہوتی ہے، لیکن اس کا متعین مفہوم آجتک نہیں بتایا گیا۔ اگر اس اصطلاح کے مدعی اس کا مفہوم واضح کر دیں تو مختلف فرقوں کے علماء شور مچا دیں کہ جسے تم دین کہتے ہو، وہ دین ہے ہی نہیں۔ لہٰذا، ان حضرات نے بھی اسی میں خیریت سمجھ رکھی ہے کہ اس اصطلاح کو مبہم رکھا جائے۔

اب "دین" کے بجائے نظام کا لفظ زیادہ پاپولر ہو رہا ہے۔ اس کی بنا پر ایک اصطلاح "اسلامی نظام" ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے ہاں خود اسلام کا مفہوم ہی متعین نہیں، اس لئے "اسلامی نظام" کی اصطلاح بھی شرمندۂ معنی نہیں ہوتی، نہ ہو سکتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ عصرِ حاضر کی سیاست میں جس مقصد کے لئے سلوگن وضع اور اختیار کئے جاتے ہیں اس مقصد کے لئے ہمارے ہاں کے مذہبی طبقہ میں اس قسم کی اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں۔ سلوگن سے مراد ہوتی ہے ایسے الفاظ جن کا مفہوم متعین نہ ہو لیکن جنہیں عوام میں پاپولر بنا کر فریقِ مقابل کے خلاف

ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اگر ذرا بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ زمانۂ قدیم کے عصرِ سحر (AGE OF MAGIC) میں جو کام، جنتر منتر، ٹونا ٹوٹکا سے لیا جاتا تھا، وہی کام عصرِ رواں میں سلوگن سے لیا جاتا ہے۔ جنتر منتر یا ٹونے ٹوٹکے ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتے تھے جن کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ اگر تم ان الفاظ کو اس طرح اتنی مرتبہ دُہراتے جاؤ گے تو تمہارا دشمن مغلوب ہو جائے گا۔ بعینہٖ یہی پوزیشن ہمارے زمانے میں سلوگن نے لے رکھی ہے۔ اور اب یہی کام ہمارے ہاں اصطلاحات سے لے لیا جاتا ہے۔ پھر جس طرح ایک سلوگن کچھ عرصہ کے بعد، کثرتِ استعمال سے غیر مؤثر ہو جاتا ہے اسی طرح ہمارے ہاں کی اصطلاحات بھی کچھ عرصہ کے بعد اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ کسی زمانے میں جو اثر، اقامتِ دین۔ حکومتِ الٰہیہ۔ اسلامی نظام وغیرہ قسم کی اصطلاحات پیدا کیا کرتی تھیں، اب یہ اُس قسم کا اثر پیدا نہیں کرتیں۔ اس بنا پر ضرورت تھی کہ ایک نئی اصطلاح وضع کی جائے۔ اور وہ اصطلاح ہے "نظامِ مصطفٰےؐ"۔ چونکہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہمارے نہایت گہرے قلبی جذبات سے ہے، اس لئے یہ اصطلاح، سابقہ اصطلاحات کے مقابلہ میں، عوام کے لئے زیادہ مؤثر اور پُرکشش ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس اصطلاح کو بھی مبہم رکھا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ ملتِ رسول اللہ کی طرح ہر فرقہ کا نظامِ مصطفٰےؐ کا تصور اپنا اپنا ہے۔

مختلف فرقوں کے علماء، تو ایک طرف، خود حنفیوں میں بریلوی اور دیوبندی حضرات کے نزدیک اس کا مفہوم الگ الگ ہے۔ موجودہ ہنگاموں میں، بریلوی فرقہ کی نمائندگی مولانا نورانی کر رہے ہیں اور دیوبندی فرقہ کی مفتی محمود صاحب؛ اور ان دونوں میں "نظامِ مصطفٰےؐ" تو ایک طرف، "نظامِ مصطفٰےؐ تحریک" میں شدید اختلاف ہے۔ لہٰذا ان کی سیاسی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اس اصطلاح (نظامِ مصطفٰےؐ) کو مبہم رکھا جائے .... اس کا کوئی ایسا مفہوم پیش ہی نہیں کیا سکتا جسے تمام فرقوں کے علماء متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اس کی وضاحت کا تقاضا کیا جائے تو اسے بلند آہنگ الفاظ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے ـــ مثلاً حال ہی میں "نوائے وقت" میں اس عنوان پر کہ "نظامِ مصطفٰےؐ کیا ہے؟" ـــ دو مبسوط مقالات شائع ہوئے ہیں۔ ایک مقالہ میں کہا گیا ہے کہ نظامِ مصطفٰےؐ یہ۔

اخلاقی لحاظ سے نظامِ مساوات ـــ سیاسی لحاظ سے نظامِ حفاظت و عدل ـــ معاشی لحاظ سے نظامِ عدل و کفالت ـــ روحانی لحاظ سے نظامِ ذکر و فکر اور للّٰہیت ـــ معاشرتی لحاظ سے نظامِ اخوت ہے۔ (نوائے وقت۔ ۲۹ رجولائی ۱۹۷۷ء)

دوسرے مقالہ میں کہا گیا ہے ـــ نظامِ مصطفٰےؐ کیا ہے؟

کائنات گیر علم ـــ یزداں شعار عبادت ـــ پاکیزہ اخلاق ـــ عظیم سیاست ـــ علم خوفِ خدا کا سبب، اور خوفِ خدا دانش کی انتہا۔ (نوائے وقت ۵ راگست ۱۹۷۷ء)

اس قسم کے ہیں حریر و اطلس کے وہ نرم و نازک پردے جن میں اس مصلحت (یا حکمتِ عملی) کو چھپایا جاتا ہے کہ اس نظام کا متعین مفہوم عوام کی نگاہوں سے اوجھل رہے ـــ کیونکہ اس کی وضاحت سے اس دعوے

کا پردہ چاک ہو جاتا ہے کہ اس مطالبہ میں تمام فرقوں کے نمائندے متفق ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں ـــــ یہ کتمانِ حقیقت کی اُسی قسم کی سعیٔ ناکام ہے جس کی مثال پہلے بھی ہمارے سامنے آچکی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں پر مشتمل اکیس علماء نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ مملکت کا ضابطۂ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب کیا جائے گا۔ اور اس کے بیس برس بعد، "متفقہ مطالبہ" کا پردہ خود اُن ہاتھوں کو، جنہوں نے یہ پردہ لٹکایا تھا، یہ کہہ کر اٹھانا پڑا کہ:-

کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاء کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے مختلف فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ (مودودی صاحب)

اس سے، اکیس علماء کے اس مطالبہ کا بھانڈا پھوٹ گیا جسے وہ ۱۹۵۱ء سے، متفقہ طور پر اسلامی کہہ کر پیش کرتے چلے آرہے تھے۔ یہ بیس پچیس برس تو خیر، نظری بحثوں میں گذر گئے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اب یہ مطالبہ عملی شکل اختیار کر لے اور اُس وقت اس اصطلاح کا متعین مفہوم سامنے لائے بغیر چارہ نہ رہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر اکتوبر ۱۹۷۷ء کے مجوزہ انتخابات کے نتیجے میں، زمامِ حکومت نظامِ مصطفےٰؐ کے مدعیوں کے ہاتھ میں آگئی تو سب سے پہلا مرحلہ، پبلک لاء کا متفق علیہ ضابطہ مرتب کرنے کا درپیش ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ مختلف فرقوں کے یہ نمائندے ایسا ضابطہ مرتب کر ہی نہیں سکیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت کیا ہوگا؟

تحریکِ پاکستان کی بنیاد دو اصولوں پر استوار تھی۔ (۱) دو قومی نظریہ اور (۲) نظریۂ پاکستان یعنی اسلام کی بنیادوں پر ایک آزاد مملکت کا قیام۔ ہندو (اور ان کی ہمنوائی میں دنیا بھر کی دیگر اقوام) کہتے تھے کہ ان بنیادوں پر کوئی مملکت استوار نہیں ہو سکتی۔ وہ زمانہ لد گیا جب مذہب کی بنیاد پر سلطنتیں قائم کی جایا کرتی تھیں۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔

سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ پر ہندو، اور ان کے ہم نواؤں نے، ببانگِ دہل اعلانات کئے کہ دیکھا ناں! جو کچھ ہم کہتے تھے وہ کس طرح سچ ثابت ہوا۔ دو قومی نظریہ کس طرح ناکام رہا؟ اور اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ جس طرح دو قومی نظریہ ناکام ثابت ہوا ہے، تم دیکھو گے کہ تمہارا دوسرا نظریہ، یعنی مذہب کی بنیادوں پر مملکت کی تشکیل ـــــ بھی اسی طرح ناکام ثابت ہوگا۔

اب، جب مختلف فرقوں کے علماء پر مشتمل پارلیمان، ایک متفق علیہ اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کرنے میں ناکام رہی، تو ہمارے یہی دشمن ڈھول پیٹ پیٹ کر اعلان کریں گے کہ دیکھا! جو کچھ ہم کہتے تھے وہ بالآخر سچ ثابت ہو کر رہا یا نہیں!

یہ اُسی روزِ بد کا لمحۂ انگیز احساس ہے جو ہمیں ان حضرات کی خدمت میں گذارش کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ مملکت کا استحکام اور اسلام کا احیاء ہوگا، تو آپ جس قدر جلد اس غلط فہمی کو دور کر دیں گے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ آپ کی موجودہ روش سے مملکت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی اور اسلام دنیا کی نظروں میں اضحوکہ بن جائے گا۔ اگر آپ فی الواقعہ اسلام کا احیاء چاہتے ہیں تو پہلے یہ طے کر لیجئے کہ اگر قانون سازی کے اختیارات آپ کے ہاتھ میں آگئے تو آپ وہ ضابطۂ حیات کس طرح مرتب

کریں گے جو آپ سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پائے۔

اگر یہ حضرات ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوں، تو ہم قوم سے بزورِ گزارش کریں گے کہ وہ آنکھیں بند کرکے ان کے سلوگنوں کے پیچھے لگنے کے بجائے، ان سے مطالبہ کرے کہ وہ اس سوال کا واضح الفاظ میں جواب دیں۔

اس سوال کا جواب کچھ بھی مشکل نہیں۔ اسے غور سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

(۱)۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، نظامِ مصطفےٰ کے مدعی مختلف فرقوں سے متعلق ہیں۔ ان میں ہر فرقہ کی فقہ (ضابطہ، قوانین) الگ الگ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک یہ حضرات اپنی اپنی فقہ کو غیر متبدل اسلامی شریعت قرار دیتے رہیں گے، کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے یہ سب اسلامی تسلیم کر لیں۔ ان کے باہمی اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ ان میں سے ہر فرقہ نے دوسرے فرقوں کے خلاف کفر کے فتوے لگا رکھے ہیں۔

(۲) ان سب میں صرف ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے قرآنِ مجید۔ لہٰذا، ان کے ایک نقطہ پر جمع ہونے کا، اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ یہ اپنی اپنی فقہ سے صرفِ نظر کرکے قرآنِ مجید کو ضابطۂ قوانین کی بنیاد قرار دیں۔ اور اسے قولِ فیصل اور حرفِ آخر تسلیم کریں۔

(۳) قرآن کریم سلوگن نہیں دیتا۔ وہ ہر بات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) اس کا دعویٰ ہے۔ یعنی ہر بات کو نکھار اور ابھار کر بیان کرنے والی کتاب۔

(۴) اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لئے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل بھی یہ دی ہے۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴/۸۲) اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بکثرت اختلافات پاتے۔ لہٰذا قرآنِ مجید کو قدرِ مشترک تسلیم کر لینے کے بعد کوئی اختلاف باقی نہیں رہ سکتا۔

(۵) الدین۔ یعنی نظامِ خداوندی۔ کے معنی ہیں خدا کو حاکم یا حکم (ہر معاملہ میں فیصلہ دینے والا) تسلیم کرنا۔ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ۔ حکم صرف خدا کا واجب الاطاعت ہے ــــ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ۔ اُس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت (اطاعت) اختیار نہ کرو۔

ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ۔ (۱۲/۴۰) یہ ہے محکم دینِ خداوندی۔

(۶) خدا کو حاکم یا حکم تسلیم کرنے کا عملی طریق اس کی کتاب کو حکم تسلیم کرنا ہے۔ (رسول اللہ کی زبانِ مبارک سے قرآن کریم میں اعلان کرایا گیا کہ) أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حکم تسلیم کروں، درآں حالیکہ اس نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو تمام

معاملات کو لکھا کر بیان کر دیتی ہے ۔۔۔۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب اللہ کو حکم ماننے سے خدا کو حکم مانا جاتا ہے۔

(۷) یہی کتاب کفر اور اسلام میں حدِ امتیاز ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتابِ خداوندی کو حکم تسلیم نہیں کرتا، تو ایسے ہی لوگوں کو کافر کہا جاتا ہے۔

(۸) خود رسول اللہؐ کو بھی یہی حکم دیا گیا تھا کہ:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

اے رسول! تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کر۔

(۹) یہی دین اللہ ہے۔ (۳/۸۳) اسی کا نام الاسلام ہے۔ یعنی کتاب اللہ کو حکم تسلیم کرنا۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (۳/۸۵)

جو شخص اس کے سوا کوئی اور دین (نظام) اختیار کرے گا، تو بارگاہِ خداوندی میں اسے شرفِ قبولیت حاصل نہیں ہوگا۔ وہ مردود قرار پائے گا۔

واضح رہے کہ چونکہ خدا نے اسلام کو دین اللہ کہا ہے اس لئے اس کا ترجمہ دینِ خداوندی ہی کرنا چاہیئے۔ خدا کے رسول، دین اللہ کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے مبعوث ہوتے تھے۔ خود کوئی دین وضع نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اسلام کو دینِ مصطفیٰؐ کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ اسے دین اللہ ہی کہنا چاہیئے۔

(۱۰) سوال پیدا ہوگا کہ اس کی پہچان کیا ہوگی کہ ہم میں دین اللہ (یا نظامِ خداوندی) قائم ہے یا نہیں؟ اس کی اولین پہچان یہ ہے کہ جس قوم میں دین اللہ قائم ہو اس میں مذہبی فرقے نہیں رہ سکتے۔ جہاں مذہبی فرقے ہوں گے نہ وہاں دین اللہ (نظامِ خداوندی) ہوگا۔ اور نہ ہی ان کے ساتھ رسول اللہؐ کا کوئی تعلق۔ اس باب میں خدا کا ارشاد نہایت واضح ہے کہ:

إِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ جائیں۔ اے رسول! تیرا ان لوگوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رہے گا۔

جو لوگ فرقوں پر قائم رہتے ہوئے "نظامِ مصطفیٰؐ" کے مدعی ہیں، انہیں اس ارشادِ خداوندی پر غور کرنا چاہیئے۔ جب (قرآنِ خداوندی کی رو سے) مصطفیٰؐ کا ان سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا، تو انہیں "نظامِ مصطفیٰؐ" کے دعوے دار ہونے کا حق کس طرح پہنچ سکتا ہے؟

ملک میں جو لوگ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ہماری ان سے گذارش ہے کہ وہ ان ارشاداتِ خداوندی پر غور کریں اور سوچیں کہ مختلف فرقوں کے نمائندوں کا یہ دعویٰ کہ وہ "نظامِ مصطفیٰؐ" قائم کریں گے، کس طرح حق پر مبنی ہو سکتا ہے؟

قرآنی آئین کے بنیادی خط و خال

یہ امر موجبِ اطمینان ہی نہیں، باعثِ مسرت بھی ہے کہ طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرآنی دعوت، نہایت خوشگوار نتائج مرتب کر رہی ہے اور سمجھنے سوچنے والے طبقہ کے دل میں قرآنی معلومات حاصل کرنے کا جذبہ اور شوق تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ گذشتہ چند ماہ میں ہم نے امورِ مملکت کے متعلق جو قرآنی تصورات پیش کئے ہیں، ان سے متاثر ہو کر، اس طبقہ کی طرف سے تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ یہ بتایا جائے کہ اگر مملکت قرآنِ مجید کو اپنے معاملات کی بنیاد قرار دے لے، تو اس کے آئین کا ڈھانچہ کس قسم کا ہوگا۔ طلوعِ اسلام اس موضوع پر شروع سے لکھتا چلا آ رہا ہے۔ مثلاً جب پہلی مجلسِ دستور ساز نے ۱۹۵۰ء میں قرار داد مقاصد اور دیگر اصولات کے مسودات مرتب کئے تو اس نے (نومبر ۱۹۵۰ء میں) "قرآنی دستورِ پاکستان" کے نام سے پہلا کتابچہ شائع کیا جو اس وقت تک آئین سازی کے سلسلہ میں اصولی رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ پھر جب، ۱۹۵۷ء میں، لاء کمیشن کا انعقاد عمل میں آیا تو ہم نے "اسلام میں قانون سازی کا اصول" کے عنوان سے (اردو اور انگریزی میں) دو کتابیں شائع کیں جو اس باب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بعد جب عسکری حکومت نے آئینی کمیشن کی تشکیل کی تو ہم نے دو مبسوط پمفلٹ شائع کئے جن میں سے ایک کا عنوان تھا۔ "اسلامی آئین کے بنیادی اصول" اور دوسرے کا "اسلامی مملکت میں قانونِ شریعت کس طرح مرتب ہوگا"۔ علاوہ ازیں، طلوعِ اسلام کی قریب قریب ہر اشاعت میں، اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا رہا۔ جب ۱۹۶۱ء میں جدید آئین مرتب کرنے کی بات چھڑی تو ہم نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان تھا۔ "قرآنی آئین کے بنیادی اصول" اب جب اس باب میں تقاضے موصول ہو رہے ہیں تو ہم نے مناسب سمجھا کہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اس کا لبِ لباب پیشِ خدمت کر دیا جائے۔ اس سے قدیمی قارئین کی تجدید یادداشت ہو جائے گی اور جن کی نظروں سے ہماری پہلی تحریریں نہیں گذریں، ان کی معلومات میں اضافہ ہو جائے گا۔ قرآنی آئین کے سلسلہ میں دو بنیادی نکات کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

دو بنیادی نکات

(۱) قرآنِ کریم انسانی زندگی کے اہم مسائل کے متعلق بالعموم اصولی راہنمائی دیتا ہے۔ ان کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ یوں کہیئے کہ وہ ایسی حدود مقرر کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے، امتِ مسلمہ (یعنی اسلامی مملکت) اپنے اپنے زمانوں

کے تقاضوں کے مطابق جزئی تفصیلات خود مرتب کرتی ہے۔ یہ اصول یا حدود غیر متبدل ہوتے ہیں۔ اور ان کی بنیادوں پر مرتب کردہ جزئیات میں، عند الضرورت، ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۲) قرآن کریم، کاروانِ ملت کے لئے ایک منتہیٰ مقرر کرتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نصب العین رکھتا ہے، جس تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچا جا سکتا ہے۔ ہمارے لئے طریقِ کار یہ ہوگا کہ قرآن کے مقرر کردہ منتہیٰ کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھیں اور پھر یہ طے کریں کہ جس مقام پر ہم اس وقت کھڑے ہیں، اس سے، اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے کونسی تدریجی منازل مقرر کریں۔ یوں یہ مملکت رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ، بتدریج اسلامی بنتی جائے گی۔ یہ نہیں کہ ادھر اس نے قرار دادِ مقاصد پاس کی، اور اُدھر ہم نے ڈھول بجانے شروع کر دیئے کہ مملکت اسلامی ہو گئی ہے۔ اس سے ہم اتنا ہی کہہ سکیں گے کہ مملکت نے اپنے اسلامی بننے کا عزم کر لیا ہے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد، اب ان اصولوں کی طرف آیئے جنہیں قرآن کریم نے اسلامی مملکت کے آئین کے لئے بطور حدود متعین کیا ہے۔ ہمارا فریضہ ان اصولوں کو سامنے لانا ہے۔ یہ کام مجلسِ آئین ساز کا ہوگا کہ وہ موجودہ حالات کے مطابق، ان اصولوں کی جزئیات، مرتب کرے۔

۱۔ اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY)

اقتدارِ اعلیٰ سے مراد ہوتی ہے مملکت کی وہ اتھارٹی جس کا فیصلہ، آخری فیصلہ ہو، اور اس سے سرکشی، مملکت کے خلاف بغاوت، قرار پائے۔ ملوکیت میں یہ اتھارٹی، بادشاہ کی ذات ہوتی ہے۔ آمریت میں ڈکٹیٹر اور مغربی اندازِ جمہوریت میں عوام ——— قرآن کی رو سے، یہ اتھارٹی نہ بادشاہ کو حاصل ہوتی ہے، نہ ڈکٹیٹر کو۔ نہ عوام کو حاصل ہوتی ہے، نہ خواص کو۔ یہ اقتدار صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کا ارشاد ہے کہ: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (۱۲/۴۰) حقِ حکومت، (آخری فیصلہ دینے کا حق) صرف خدا کو حاصل ہے۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) وہ اپنے اس حق میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ۔ (۲۱/۲۳) اس کے کسی فیصلہ کو (QUESTION) نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے فلاں قانون ایسا کیوں بنایا ہے۔ اس کے سوا ہر اتھارٹی کو (QUESTION) کیا جا سکتا ہے۔ وہ (ACCOLINTABLE) ہوتی ہے۔

لیکن خدا تو نہ کسی کے سامنے آتا ہے اور نہ ہی ہم اس کی بات سن سکتے ہیں، اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے حقِ حکومت کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس کا جواب اس نے خود ہی دے دیا کہ خدا کی حاکمیت اس کی کتاب کی اطاعت کے ذریعہ اختیار کی جائے۔ اس کا ارشاد ہے کہ:۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ

مُفَصَّلاً۔ (۶/۱۱۵)

(اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم بنا لوں، درآنحالیکہ اس نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیج دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

لہٰذا، اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے اور ثانی الذکر میں انسانوں کو ـــــ خواہ وہ کوئی ایک فرد ہو، یا افراد کی جماعت ـــ یہی کفر اور اسلام کا امتیازی نشان ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے۔ وہی لوگ کافر ہیں۔

اسی لئے، خود حضورؐ نبی اکرم سے، جنہوں نے سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم کی تھی، کہا گیا کہ:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸)

تم ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرو۔

لہٰذا، اسلامی مملکت کے آئین کی پہلی شق اوّل یہ ہونی چاہیئے کہ:

(۱) اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کو حاصل ہوگا جس کی عملی شکل یہ ہوگی کہ حکومت، خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) کے احکام و اصولات کے مطابق قائم کی جائے گی اور اس کے خلاف کوئی قانون، حکم یا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

۲۔ مجلسِ آئین و قوانین ساز کے حدود

قرآن کریم کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ... (۶/۱۱۵)

تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

اس لئے سربراہِ مملکت ہو یا پارلیمان کا ادارہ، قرآنی احکام و اصولات میں، نہ تو حک و اضافہ کر سکتا ہے اور نہ کسی قسم کی تبدیلی۔ پارلیمان، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، مملکت کے لئے قانون بنا سکتی ہے اس اعتبار سے اسلامی مملکت کی "جمہوریت" لامحدود اور غیر مشروط نہیں ہو سکتی۔ یہ (CONTROLLED DEMOCRACY) ہوگی اور اس پر کنٹرول خدا کی کتاب کا ہوگا۔

لہٰذا، اسلامی مملکت کے آئین کی دوسری شق یہ ہونی چاہیئے کہ:

(۲) مملکت کے قوانین کی اساس قرآن کریم ہوگی اور مجلسِ قوانین ساز، اس کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، قانون مدوّن کرنے کی مجاز ہوگی۔ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔

۳۔ فیصلہ کن ادارہ

اس سلسلہ میں یہ سوال سامنے آئے گا کہ اس بات کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا کہ فلاں قانون، قرآن مجید کے مطابق ہے یا نہیں۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی رو سے ایک اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ذیل میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ ہم نے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ یہ "سفید ہاتھی" محض دریشی ہنڈیاں ہیں جن سے کوئی مفید مطلب نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ اتنے عرصہ کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ ادارے بیکار محض ہیں انہیں ختم کر دینا چاہیئے اور ان کی جگہ ایک لاء کمیشن مقرر کر دینا چاہیئے جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ ملک کے مروّجہ قوانین کو قرآن کے مطابق بنانے کی سفارشات کرے اور آئندہ بھی جو قانون زیرِ ترتیب آئے اسے قرآن مجید کی روشنی میں پرکھ کر اپنی سفارش پیش کرے۔ لیکن اس بات کا آخری فیصلہ عدالتِ عالیہ کرے کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ مملکت کے ہر باشندے کو حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اس مقصد کے لئے عدالتِ عالیہ کے دروازے پر دستک دے سکے۔ بنا بریں، آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ:-

(۳) اس سوال کا فیصلہ کہ فلاں قانون، قرآن کے مطابق ہے یا نہیں، مملکت کی عدالتِ عالیہ کریگی جس میں قانون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات، بطور وکیل پیش ہو سکیں گے۔

۴۔ نظامِ شورائیت

اسلامی مملکت کا نظامِ حکومت، شورائیت پر مبنی ہے۔ یعنی مملکت مشتمل ہوتی ہے پوری کی پوری اُمت پر، اور اس کا کاروبار، افرادِ اُمت کے باہمی مشورے سے طے پاتا ہے۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) قرآن کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ خود نبی اکرمؐ سے بھی کہا گیا تھا کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ۔ (۳/۱۵۸) امورِ مملکت میں تم ان سے مشورہ کیا کرو۔ قرآن نے صرف یہ اصول دیا ہے۔ اس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی، اس کا تعین خود نہیں کیا کیونکہ عملی شکل مختلف زمانوں میں مختلف ہو سکتی ہے۔ ہماری ضروریات کے مطابق، اس کا تعین ہمیں خود کرنا چاہیئے۔

اس اصول میں، قرآن کریم نے (بَيْنَهُمْ) کی جو شرط عائد کی ہے (یعنی افرادِ اُمت آپس میں مشورہ کریں) وہ بڑی اہم ہے اور دین میں بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی اسلام میں، معیارِ قومیت ہے ہم اس موضوع پر ۱۹۳۸ء سے لکھتے چلے آئے ہیں ـــــ اس لئے کہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہی اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام کی رو سے، قومیت کا معیار ملک اور نسل کا اشتراک نہیں بلکہ دین کا اشتراک ہے اور طلوعِ اسلام اس دعویٰ کو، قرآن کریم اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں، یہ تکرار و اصرار پیش کر رہا تھا۔ اسی معیارِ قومیت کے مطابق پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔ اسے دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔

ہم اس موضوع پر اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ اس پر کسی اضافہ یا وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس (دو قومی نظریہ) کا عملی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم قانون سازی کے امور میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اس لئے اسلامی مملکت کی مجلسِ قوانین ساز صرف مسلمانوں پر مشتمل ہوگی۔ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی پارلیمان میں ابوجہل کا کیا کام؟ (اس مملکت میں غیر مسلموں کی پوزیشن کیا ہوگی، اس کی بابت ذرا آگے چل کر گفتگو کی جائے گی۔) اگر مشاورتی مشینری کا طریق انتخابی ہوگا تو امیدواروں کو انتخابی مہم کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی۔ ان کا ذاتی کردار اور ماضی کی زندگی ان کے لئے معیارِ انتخاب ہوگا۔ قوم اس کا موازنہ خود کرلے گی۔ آئینِ پاکستان کی اگلی شق یہ ہوگی:

(۴) مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، مسلم قوم کا جزو نہیں قرار پا سکتے۔ اس لئے انہیں امورِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ نہ وہ اس کی پارلیمان کے ممبر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان ممبروں کے انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔ انہیں وہ مراعات حاصل ہوں گی جن کی تشریح آئین کی شق ۱۲ میں کی گئی ہے۔

۵۔ مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں

قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ انسانوں کے اختلافات مٹانے کا ذریعہ "کتاب" قرار دیا گیا ہے، تو آپ نے غور فرمایا ہے کہ اس کا عملی مفہوم کیا ہے؟ کتاب کے معنی ضابطۂ قوانین کے ہیں۔ ایک ملک میں بسنے والے افراد، ایک قوم اسی صورت میں بنتے ہیں جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کی اطاعت کریں۔ بالفاظِ دیگر، قوم کی وحدت کا انحصار، قانون کی وحدت پر ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کے مختلف گروہ مختلف قوانین کے تابع زندگی بسر کریں، تو ان میں کبھی وحدت نہیں پیدا ہو سکتی۔ امتِ مسلمہ بھی امتِ واحدہ اسی صورت میں بن سکتی ہے جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کے تابع رہے اور چونکہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی ضابطۂ قوانین — (قرآنِ مجید) کی اطاعت لازم قرار دی گئی ہے اس لئے ان میں تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم میں نہ تو شخصی (PERSONAL LAWS) اور تمدنی قوانین (PUBLIC LAWS) کی تفریق کی گئی ہے اور نہ ہی اس میں مختلف فرقوں کے لئے مختلف فقہوں کا کوئی تصور ہے۔ امت میں فرقوں کا وجود، اس کی نصِ صریح کی رُو سے شرک ہے۔ (۳۰/۳۱) اور چونکہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت نہیں، اس لئے جس طرح مذہبی فرقوں کا وجود، از روئے قرآن شرک ہے، اسی طرح سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی خلافِ اسلام ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے سیاستِ فرعونی سے تعبیر کیا ہے۔ (۲۸/۴) ہمیں تسلیم ہے کہ بہ حالاتِ موجودہ مذہبی فرقہ بندی کو بیک جنبشِ قلم نہیں مٹایا جا سکتا، لیکن سیاسی پارٹیوں کو تو از روئے قانون فوراً ختم کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے، اگر

(۱) قرآن کی اساس پر ملک کا قانون مرتب کیا جائے تو اس کا اطلاق مملکت کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں

طور پر ہوگا۔ اس سے فرقہ بندی کی گرہیں خود بخود ڈھیلی پڑ جائیں گی۔

(۴) تعلیم کا انتظام اس طرح سے کیا جائے کہ مذہبی اور سیکولر تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی ثنویت ختم کرکے سب بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے اُن میں عام دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کی بلند اقدار کا شعور بھی پیدا ہوتا چلا جائے اس طرح ان کے دل و دماغ سے فرقہ وارانہ امتیازات کی لکیریں خود بخود مٹتی چلی جائیں۔

لہٰذا، ہمارے مجوزہ آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ:۔

(۵) ——(۱) قرآنِ کریم کی اساس پر مملکت کے لئے جو قانون مرتب کیا جائے گا اس کا اطلاق ملک کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں ہوگا۔

(۲) سیاسی پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔

۴۔ بین الملّی تعلقات

دین کے اشتراک پر قومیت کی تشکیل کا صرف یہ معنی نہیں کہ کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمان، غیر مسلموں سے الگ، ایک جداگانہ قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے (اور قرآن کا درحقیقت منشا بھی یہی تھا) کہ دین کے رشتہ میں منسلک افراد خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی بسنے ہوں، ایک قوم کے افراد قرار پائیں گے۔ امتِ واحدہ دنیا میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر مشتمل ہوتی ہے نہ کہ کسی خاص خطۂ زمین میں بسنے والے مسلمانوں پر۔ اس اعتبار سے دیکھیئے تو دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انتظامی نقطۂ نگاہ سے کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کی انتظامی مقاصد کیلئے الگ الگ حکومتیں تو ہو سکتی ہیں لیکن وہ الگ الگ اقوام میں نہیں بٹ سکتے۔ لیکن چونکہ اس وقت مختلف ممالک کے مسلمانوں نے اپنی اپنی الگ قومیت قائم کر رکھی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہم اتنا تو نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی قومیتوں کو امتِ واحدہ میں جذب کر دیں۔ ایسا رفتہ رفتہ ہی ہو سکے گا۔ ویسے اتنا ہم آج ہی کر سکتے ہیں کہ دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں سے ہم اس قسم کے تعلقات وابستہ کریں جیسے ایک قوم کے افراد میں ہوتے ہیں۔ بنا بریں، قرآنی دستورِ پاکستان کی ایک شق یہ بھی ہونی چاہیئے کہ:۔

(۶) دین کے اشتراک کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک قوم کے افراد تسلیم کیا جائے۔ دیگر مسلم ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد قرآنِ کریم کا یہی اساسی اصول ہوگا۔

۷۔ نظامِ حکومت

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآن کی رُو سے، ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان، ایک قوم کے افراد ہیں، لیکن ہم نے پاکستان میں ایسا نظام رائج کر رکھا ہے جس کی وجہ سے، خود پاکستان میں بسنے والے مسلمان بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔ ہم نے پہلے ملک کو دو بازوؤں میں تقسیم کیا اور اب، مغربی بازو کو چار ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ یہ تقسیم اگر محض انتظامی مقاصد کے لئے ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ہم نے ان خطوں میں الگ الگ مفادات کی ایسی دیواریں کھڑی کر دیں جن سے یہ قوم، مختلف اقوام میں تقسیم ہو گئی، اور وہ بھی ایسی اقوام جن میں باہمی رقابت، عصبیت اور نفرت کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے چلے جائیں۔ اگر یہی صورتِ حالات باقی رہی تو پاکستان کے مسلمان کبھی ایک قوم کے رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکیں گے، اور مفادات باہمی کے تصادم کی خلیج بڑھتے بڑھتے معلوم نہیں کہاں تک لے جائے گی۔۔۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے رفتہ رفتہ، بلوچی۔ سندھی۔ افغانی۔ پنجابی کے امتیازات مٹ کر، پوری قوم، امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھل جائے۔

۸۔ تشکیلِ حکومت

قرآنِ کریم، حکومت کی شکل (FORM OF GOVERNMENT) سے بحث نہیں کرتا۔ اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑتا ہے کہ وہ اپنے حالات کے مطابق جس قسم کی شکل چاہیں متعین کر لیں۔ بشرطیکہ وہ مشاورت کے اصول سے نہ ٹکرائے۔ اس ضمن میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت کی پارلیمان میں، حزبِ اختلاف کا وجود نہیں ہوتا۔ غیر مسلم تو پارلیمان کے ممبر ہی نہیں ہو سکتے اور مسلمانوں کا دو ایسی پارٹیوں میں تقسیم ہو جانا جن میں سے ایک پارٹی کا مقصد ہی دوسری پارٹی سے برسرِ پیکار رہنا ہو، اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ باہمی مشاورت میں اختلافِ رائے کا سوال دوسرا ہے۔ لیکن اُمت کا مستقل طور پر دو گروہوں میں بٹ جانا، غیر اسلامی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حزبِ مخالف کے بغیر جمہوری نظام قابلِ عمل نہیں ہوتا۔ اور ہم کہتے ہیں کہ جہنم میں جائے وہ نظام جس کا لازمی نتیجہ، اُمت کا متخالف اور متحارب گروہوں میں بٹے رہنا ہو۔ یہ تو قرآنی تصور کے یکسر خلاف ہے۔

قوم میں بہرحال، عام علمی اور ذہنی سطح کے افراد بھی ہوں گے اور خواص، صلاحیتوں کے مالک افراد بھی۔ مجلسِ مشاورت میں ان دونوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پارلیمان کا دو ایوانوں پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا، آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ:۔

(۷) پارلیمان، دو ایوانوں پر مشتمل ہو گی۔ ایک ایوان، عام انتخابِ ملت پر مشتمل اور دوسرا خواص صلاحیتوں کے اہل، اعیانِ اُمت پر۔

پارلیمان کے ایوانوں میں پارٹیوں کا وجود قانوناً ممنوع ہوگا۔ تمام امور باہمی مشاورت سے طے ہوں گے اور حزبِ موافق اور حزبِ مخالف کا غیر اسلامی تصوّر کارفرما نہیں ہوگا۔

۸۔ الف۔ اصولِ اہلیت

ذمہ داریاں سونپنے کے سلسلہ میں قرآن کریم نے اصول یہ مقرر کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا...... (۵۸/۴) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو اختیارات تمہیں بطورِ امانت دیئے گئے ہیں انہیں ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ اس "اہلیت" میں، علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ، سیرت و کردار کی پاکیزگی بنیادی شرط ہے کیونکہ قرآن کی رو سے، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (۱۳/۴۹) تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہوں اور اپنے ہی جذبات و خیالات کے پیچھے لگ جائیں، ان کا حکم نہیں مانا جائے گا۔ سورۂ کہف میں ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (۲۸/۱۸)

تم اس کی اطاعت مت کرو جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہو گیا، اور اس نے اپنی خواہشات کا اتباع شروع کر دیا اور اس طرح اس کا معاملہ حد سے گذر گیا۔

قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ، لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ۔ (۴۶/۱۱) جس کا عمل غیر صالح ہو جائے وہ تمہارے اہل میں سے نہیں۔ لہٰذا، مملکت کے افسرانِ ماتحت سے لے کر صدارتِ عظمیٰ تک، اہلیت، صالحیت اور تقویٰ (پاکیزگیٔ سیرت) کی شرائط ہر ایک پر عائد ہوں گی اور معاشرہ میں مدارج جوہرِ ذاتی اور حسنِ کردار کی رُو سے متعین کئے جائیں گے۔ وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ (۱۹/۴۶) ارشادِ خداوندی ہے۔ لہٰذا، آئینِ مملکت کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ:-

(۸) صدرِ مملکت، اس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان (کیبنٹ) وزرا، ارکانِ مجالسِ مقننہ (پارلیمان) اربابِ نظم و نسق، افسرانِ ماتحت، اور ان دیگر افراد پر، جو کسی نہ کسی انداز سے امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے متعلق ہوں، حسبِ ذیل شرائط کا اطلاق ہوگا۔

(۱) قرآنِ کریم کے اصول و احکام سے واقفیت۔

(۲) متعلقہ امور کی سرانجام کی کماحقہٗ اہلیت۔

(۳) صالحیت یعنی سیرت و کردار کی پاکیزگی۔

(۴) ذاتی مفادات و جذبات سے بلند ہو کر، معاملات کی سرانجام دہی کی صلاحیت۔

اگر کوئی شخص کسی وقت ان شرائط میں سے کسی ایک شرط پر پورا نہ اترے تو عدالتِ عالیہ ایسا طریقِ کار وضع کرے گی جس سے اسے نہایت پُرامن طریق سے معطل یا برطرف کر دیا جائے۔ عدلیہ کے ارکان ایک مدتِ معینہ کے لئے قوم کے منتخب کردہ ہوں گے۔

۸۔ (ب)۔ نظامِ تعلیم

قوم کا مدار، بڑھنے پھولنے پھلنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت پر ہے اور اس کا مناسب انتظام کرنا اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی رُو سے، بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری ان کے والدین کے سر پر نہیں ہوگی بلکہ یہ حکومت کی اجتماعی ذمہ داری ہوگی۔ وہ مختلف مدارج پر، بچوں کو چھانٹتی چلی جائے گی اور ہر بچے کی مزید تعلیم کا انتظام اس کی ذہنی افتاد اور طبعی رجحان کے مطابق کرتی جائے گی۔

نظامِ تعلیم میں، مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ بیجا اسلامی تفریق ختم کر دی جائے گی جس کی رُو سے الگ مذہبی درسگاہوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ طالب علموں کو علومِ عصرِ حاضر کی تعلیم اس انداز سے دی جائے گی کہ وہ جو مضمون بھی پڑھیں، اس میں دیکھ سکیں کہ قرآنِ مجید اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ ان کی تعلیم۔

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

کی عملی مثال پیش کرے گی۔ بنا بریں، قرآنی آئین کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ:۔

(۹) قوم کے بچوں کی (اوّل سے آخر تک) تعلیم کی ذمہ داری، انفرادی طور پر والدین کی نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر حکومت کی ہوگی۔ نظامِ تعلیم میں، مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ تفریق کو ختم کر دیا جائے گا اور طالب علموں کو دنیاوی علوم کی تعلیم اس طرح دی جائے گی کہ وہ ہر شعبہ میں یہ جانچنے کے قابل ہو سکیں کہ قرآنِ کریم اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔

۹۔ عدلیہ

اسلامی مملکت کا پورا نظام، عدل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ عدل میں عمرانی عدل بھی شامل ہے اور قانونی عدل بھی۔ جہاں تک عدلِ عمرانی کا تعلق ہے، قرآن کے اصول یہ ہیں کہ:۔

(۱) تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم سمجھا جائے۔

(۲) ہر ایک کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں ذرائع اور مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

(۳) معاشرہ میں ہر ایک کی پوزیشن ذاتی صلاحیتوں کی رُو سے متعین کی جائے۔

(۴) ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری سونپی جائے۔

(۵) بنیادی حقوقِ انسانیت کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں[1]۔

لہٰذا، کوئی ایسا قانون یا طریقِ عمل جس کی رو سے، پیدائشی نسبت کے اعتبار سے انسان اور انسان میں فرق کیا جائے، غیر قرآنی اور غیر آئینی متصور ہوگا۔ واضح رہے کہ امورِ مملکت کے سلسلہ میں، مسلم اور غیر مسلم میں جو امتیاز کیا جاتا ہے، وہ اس اعتبار سے نہیں ہوتا کہ ایک شخص غیر مسلموں کے گھر کیوں پیدا ہو گیا ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے تو نہ کوئی مومن ہوتا ہے نہ کافر ——— یہ امتیاز اس لئے روا رکھا جاتا ہے کہ غیر مسلم اس آئیڈیالوجی کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا جس پر اسلامی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جو مملکت بھی کسی آئیڈیالوجی کی بنا پر قائم ہوگی اس میں ان لوگوں کو شریکِ حکم نہیں کیا جا سکتا جو اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کریں۔

جہاں تک قانونی عدل کا تعلق ہے، عدل کی تعریف (DEFINITION) یہ کی جاتی ہے کہ متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ قانون کی رُو سے کیا جائے۔ یہ درست ہے، لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر خود قانون ہی مبنی بر عدل نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا؟ اس کے نزدیک قانون کے مبنی بر عدل ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ خدا کی مقرر کردہ حدود کے مطابق ہو۔ اس لئے اس نے عدل کی شرط یہ قرار دی ہے کہ: یَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ - (۷/۱۸۱) الحق کے مطابق عدل کیا جائے۔ اور الحق سے مراد وحیٔ خداوندی ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم نے یہ تجویز کیا ہے کہ مملکت کی عدالتِ عالیہ اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ ملک میں نافذ ہونے والا قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں ——— یعنی بجائے اس کے کہ ملک میں ایک غلط (خلافِ قرآن) قانون نافذ ہو جائے اور بعد میں اسے عدالتوں میں چیلنج کیا جائے۔ یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ عدالتِ عالیہ پہلے ہی دیکھ لے کہ مجوزہ قانون خلافِ قرآن تو نہیں۔

عدل کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا حصول بلا قیمت ہو۔ آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی صورت کبھی عدل کہلا سکتی ہے کہ آپ کسی صاحبِ قوت سے جا کر کہیں کہ میں کمزور ہوں، اور فلاں زور آور میرا حق دبا کر بیٹھ گیا ہے۔ آپ میری مدد کریں اور میرا حق اس سے دلا دیں۔ اور وہ آپ سے کہے کہ مجھے پانسو روپیہ دو تب تمہاری مدد کروں گا! اسلامی حکومت کا تو یہ فریضہ ہے کہ وہ مظلوم کی مدد کرے اور حق دار کو اس کا حق دلا دے۔ ایسا کرنے میں مظلوم سے معاوضہ کس بات کا؟ یہ تو مملکت کا بنیادی فریضہ ہے اور فریضہ کی ادائیگی کا معاوضہ کیسا؟

اسلامی مملکت میں عدل کا تقاضا ایک اور بھی ہے۔ حکومت اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی جان، مال، عصمت، عزت، آبرو کی حفاظت کرے گی۔ اگر کسی شخص کا (اس کی اپنی غلطی یا غفلت کے بغیر)

---

[1] بنیادی حقوقِ انسانیت کے عنوان سے ہم ایک مستقل پمفلٹ شائع کر چکے ہیں۔ اس کا ملخص "نظامِ مصطفیٰ" کے زیرِ عنوان درج کیا جا چکا ہے۔ ملاحظہ ہو طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۷ء۔

اس باب میں کوئی نقصان ہوتا ہے تو اس کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔ حکومت، کا فریضہ یہ ہے کہ :-

(۱) اس شخص کے نقصان کی امکانی تلافی کرے۔ اور

(۲) مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے تاکہ معاشرہ میں جرائم کی روک تھام ہو جائے۔

آپ سوچئے کہ ایک شخص کا ہزار روپیہ چوری چلا جاتا ہے اور حکومت، چور کو سال بھر کے لئے قید کر دیتی ہے، تو اس سے اس شخص کے ساتھ عدل کیا ہوا جس کا مال چوری چلا گیا تھا! چور کو سزا دینا، ظالم کے ساتھ عدل ہوا، مظلوم کے ساتھ نہیں۔ عدل، ظالم اور مظلوم دونوں کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

قرآنی عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جب تک کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے، نہ اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے اور نہ ہی وہ معاشرہ کی نگاہوں میں حقیر سمجھا جائے۔ تفتیش کے سلسلہ میں ملزم پر پولیس کا تشدد، یا عدالتی فیصلہ تک ملزم کو جیل خانہ میں محبوس رکھنا، عدل کے منافی ہے ـــــ اور بغیر مقدمہ چلائے کسی کو سزا دے دینا سراسر ظلم۔

قرآنِ کریم نے بعض جرائم (قتل، چوری، زنا اور بغاوت) کی سزا بھی مقرر کی ہے۔ یہ سزائیں کن حالات میں اور کن شرائط کے مطابق دی جا سکتی ہیں، اس کا فیصلہ اسلامی مملکت کرے گی۔

قرآنِ کریم نے اسلامی معاشرہ کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۲۷۷) کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ خوف، خطرہ کے احساس سے لاحق ہوتا ہے اور حزن، دل کی افسردگی اور پریشانی کو کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے ـــــ کہ افرادِ مملکت اپنے آپ کو ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ و مامون محسوس کریں اور امن پسند شہریوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ عدل کا بنیادی تقاضا ہوگا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ۔ (۶/۱۶۵) اسلامی معاشرہ میں کبھی ایسی صورت پیدا نہیں ہوگی کہ بوجھ کسی کا ہو اور اُسے اٹھانا کسی اور کو پڑے۔ ہر شخص کو اپنا فریضہ آپ ادا کرنا ہوگا اور ہر فرد اپنے اعمال کے نتائج کا آپ ذمہ دار ہوگا۔ اس میں، نہ کوئی مجرم قصاص (جرم کے مکافات) سے بچ سکے گا اور نہ ہی کسی بے گناہ کو ستایا جائے گا۔ اس میں "کرے کوئی اور بھرے کوئی" کی دھاندلی بھی نہیں ہوگی اور قانون کی نگاہوں میں چھوٹے اور بڑے کی تمیز بھی نہیں ـــــ حتیٰ کہ سربراہِ مملکت بھی قانون سے بالا نہیں سمجھا جائے گا۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ۔ (۲/۲۷۹) اس معاشرہ کا اصول ہوگا ـــــ یعنی نہ تم کسی پر زیادتی کرو، نہ تم پر کوئی زیادتی کرنے پائے۔ لہٰذا، اسلامی مملکت کے آئین میں یہ شق بھی ہونی چاہیئے کہ :-

(۹) معاشرتی اور قانونی عدل، مملکت کا بنیادی فریضہ ہوگا۔ معاشرتی عدل سے مراد یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جن کی تشریح "بنیادی حقوق" سے متعلق باب میں کی گئی ہے اور ان کے عدم حصول کی صورت میں، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکے گا۔

قانونی عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر متنازعہ معاملہ کا فیصلہ قانون کی رُو سے ہوگا، اور اس

کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ نیز فیصلہ میں یہ امر ملحوظ رکھا جائے گا کہ مظلوم کے نقصان کی بھی امکانی تلافی ہو جائے۔

۱۰۔ معاشی نظام

قرآن کریم نے کہا ہے کہ مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں، بلکہ وہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ اور وہ مقصد یہ ہے۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

جو مملکت خدا کے نام پر قائم ہو، اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ انہیں پورا کرے۔ لہٰذا، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی مملکت ایسی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک وسائلِ پیداوار اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ اگر وسائلِ پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہیں تو مملکت اپنی اس ذمہ داری کو پورا کس طرح کر سکتی ہے؟[1]

وسائلِ پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض) کو حاصل ہے اور زمین کو خدا نے اَرْضُ اللّٰهِ (۴/۹۷) "خدا کی زمین" قرار دیا ہے۔ اسے نوعِ انسان کے روزی کا سامان بنایا ہے۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ۔ (۷/۱۰) اس میں جو کچھ ہے، رِزْقًا لِّلْعِبَادِ ہے۔ یعنی بندوں کے لئے رزق (۵۰/۱۱) لہٰذا اسے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِينَ۔ (۴۱/۱۰) رہنا چاہیئے۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کیلئے یکساں طور پر کھلی۔ اسے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ۔ (۵۶/۷۳) یعنی تمام بھوکوں کے لئے سامانِ رزق ہونا چاہیئے۔

زمین سے ایک تو سامانِ خوراک برآمد ہوتا ہے اور دوسرے وہ تمام خام مسالہ (RAW MATERIAL) معدنیات وغیرہ جن سے مصنوعات تیار ہوتی ہیں۔ لہٰذا، مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۲/۲۶۷) میں زراعت اور صنعت و حرفت، دونوں آ جاتی ہیں۔

اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے کہ مملکت، ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں صرف اس صورت میں لے سکتی ہے جب وہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو۔ اگر وہ یہ ذمہ داری پوری نہیں کرتی تو اسے وسائلِ پیداوار کو اپنی تحویل میں لینے یا رکھنے کا کوئی حق

---

[1] قرآن کے معاشی نظام کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

نہیں رہتا۔ اگر مملکت ایسا کرے گی تو وہ غاصب قرار پائے گی۔ اس مقصد کے لئے عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہر فردِ معاشرہ کو حاصل ہوگا۔ بنا بریں، آئین میں ایک شق یہ بھی رکھی جائے گی۔

تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔ مملکت اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے وسائلِ پیداوار اپنی تحویل میں رکھے گی۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں قاصر رہے گی تو اسے، وسائلِ پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھنے کا حق باقی نہیں رہے گا۔ اس مقصد کے لئے افرادِ معاشرہ کو حق حاصل ہوگا کہ وہ عدالتِ عالیہ کی طرف رجوع کر سکیں۔

یہ ہے قرآن نے معاشی پروگرام کا منتہیٰ۔ اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ اسے اپنے آئین میں بطور نصب العین (ULTIMATE GOAL) درج کرے۔ اور اس کے بعد ایک عملی پروگرام مرتب کرے جس کی رو سے آہستہ آہستہ بتدریج اس منتہیٰ تک پہنچا جا سکے۔

۱۱۔ غیر مسلموں کی پوزیشن

اس آئین کی شق ۱ میں بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، مسلم قوم کے افراد نہیں تسلیم کئے جا سکتے، اس لئے انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام ان لوگوں پر یہ دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا ہے۔ وہ اپنی آئیڈیالوجی کی دعوت کو عام کرتا ہے۔ یعنی وہ اس دعوت کو دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے بلا لحاظ رنگ، نسل، وطن، زبان، مذہب یکساں طور پر پیش کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی پر خود غور و فکر کریں، اور اس کے بعد اگر، علیٰ وجہ البصیرت اور بطیبِ خاطر (یعنی دل اور دماغ کی رضامندی سے) سمجھیں کہ یہ آئیڈیالوجی ان کے لئے قابلِ قبول ہے تو اسے قبول کر لیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں، تو اسے مسترد کر دیں۔ اس میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہوگا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ (۲۵۶/۲)

اس سے قرآن نے، اسلامی ملت میں شامل ہونے اور اسلامی مملکت میں شریکِ کار بننے کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے اندر داخل ہو جائے۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا۔ (۱۹/۷۳) "جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے"۔ اس "اذنِ عام" کے بعد اگر کوئی شخص اس کے اندر آنا نہیں چاہتا تھا تو وہ اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہے۔ اس سے اگر وہ کسی قسم کے نقصان میں رہتا ہے تو اسے اس کی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ —— خود کردہ را علاجے نیست —— یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص کسی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے لیکن اسے تسلیم کرنے والوں کو جو مفاد حاصل ہیں، ان میں برابر کا شریک ہونا چاہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے انکار سے اسے کچھ نقصان ہوتا ہے تو اسے اس نقصان کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس انکار سے انہوں نے خیر و برکت کے جو دروازے اپنے اوپر بند کئے ہیں، اس کے —— وہ خود ذمہ دار

ہیں۔ اس کا افسوس ضرور ہے۔ لیکن اس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔ علاج خود ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ وہ جس وقت بھی اپنی غلطی کو محسوس کریں، اس کا ازالہ کر لیں۔ اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کر لیں اور بلا روک ٹوک اس کے اندر داخل ہو جائیں۔

حیرت ہے کہ بعض حلقوں میں اس نظریہ کو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا اور اسے "تنگ نظری" پر محمول کیا جاتا ہے حالانکہ کوئی نظام جو آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر استوار ہو، ان لوگوں کو کبھی شریکِ حکومت نہیں کر سکتا جو اس آئیڈیالوجی کے مخالف ہوں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں کوئی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جنہیں قرآن کریم انسانوں کے لئے بنیادی حقوق قرار دیتا ہے۔ ان کی جان، مال، عزت، عبادت گاہیں سب محفوظ ہوں گی۔ انہیں شخصی مذہب کی آزادی ہوگی۔ ان سے حسن سلوک کیا جائے گا۔ (۶۰/۸) ان سے ہر حال میں عدل کیا جائے گا۔ (۵/۸)۔

ان تمام مراعات کے باوجود، اگر یہ غیر مسلم ترکِ وطن کرنا چاہیں تو انہیں ان کے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام اسلامی مملکت کے ذمہ ہوگا۔ قرآن میں ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۹/۶)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس پناہ لے تو اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر (اگر وہ کہیں اور جانا چاہے تو) اسے اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ یہ بات سمجھتے نہیں (کہ قرآن کریم کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔)

لیکن اگر وہ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے اس کے آئین سے سرکشی برتیں تو انہیں بغاوت کی سزا ملے گی۔ (۵/۳۳–۳۴)۔

یہ سزا مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے یکساں ہے ــــ لہٰذا، اسلامی آئین کی ایک شق یہ ہوگی کہ یہ

(۱۰) ــــ مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، امورِ مملکت میں شریک نہیں کئے جا سکیں گے، کیونکہ وہ اسلامی آئین کو تسلیم نہیں کرتے لیکن ان لوگوں کو تمام بنیادی حقوقِ انسانیت حاصل ہوں گے۔[۱] ان کی جان، مال، آبرو، پرستش گاہیں محفوظ رہیں گی۔ انہیں شخصی مذہبی آزادی ہوگی۔ ان سے عدل و انصاف کرتے ہیں، ان میں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔

---

[۱] "بنیادی حقوقِ انسانیت" کے متعلق ہم الگ پمفلٹ شائع کر چکے ہیں۔ اسے "آئین" میں شامل کر لینا چاہئے۔

حرفِ آخر

یہ ہیں ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق، اس آئین کے بنیادی اصول جنہیں قرآن کریم، اسلامی مملکت کا اساسی ضابطہ قرار دیتا ہے۔ اس آئین کے علاوہ کوئی اور آئین، میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتا اس لئے کہ یہ آئین ان اصولوں پر مبنی ہے جن کے مطابق کائنات کا یہ کارگہِ عظیم اس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے۔ قرآن میں ہے۔ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ۔ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ حیات اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا۔ (۳/۸۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب طوعاً و کرہاً اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے۔" انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو خدا کے قوانین کو بطور ضابطۂ زندگی اختیار کرے اور چاہے تو اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرے۔ لیکن اسے اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ:-

مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (۳/۸۴)

جو کوئی الاسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کا وہ دین (آئین) میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرالامر دیکھ لے گا کہ وہ کس قدر نقصان میں رہا۔

یہ آئین قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کا ضابطۂ حیات قرآن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اس مملکت میں کوئی ایسا نظریہ، تصور یا قانون بار پا سکتا ہے جو قرآنی اصولوں کے خلاف ہو۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔ (۶/۱۱۵)

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح ضابطۂ قوانین نازل کر دیا ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔ سو تو اس باب میں جھگڑا کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اس آئین کے اصول ہر طرح سے مکمل ہیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (۶/۱۱۵)

اور تیرے رب کی بات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہی آئین خدا کی طرف سے عطا کردہ ابدی حقیقتوں پر مبنی ہے۔ اس کے سوا، انسانوں نے جو آئین و ضوابط مرتب کئے ہیں وہ حقیقت کے متعلق ظن و قیاس پر مبنی ہیں خواہ ان کے متبعین کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ملتِ اسلامیہ خدا کے دیئے ہوئے الدّین کے سوا، کسی اور آئین کا اتباع نہیں کر سکتی۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔۔۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ (۶/۱۱۶)

اگر تو ان لوگوں کی بات مانتا جائے جو دنیا میں اکثریت میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ (محض) ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں (اس لئے ان کے پیچھے لگنے والے بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔)

اس لئے آئینِ خداوندی کو چھوڑ کر، دیگر اقوام کے آئین و ضوابط کا اتباع کرنا، مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ دوسری اقوام کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ان کے ہاں کی کوئی ایسی چیز قبول نہیں کی جا سکتی جو قرآن کے آئین اور نظام کے خلاف ہو۔ اسلامی آئین کی اصل و بنیاد صرف خدا کی کتاب ہے۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ۔ (۷/۱۸۵)

پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ آئین عطا کرتا ہے۔ اس لئے، اس کی رُو سے، اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ آپ کچھ اصول، قرآن کے اختیار کر لیں اور کچھ خارج از قرآن، دیگر اقوام کے آئین و ضوابط سے مستعار لے کر۔ ایسا کرنا شرک ہوگا۔ قرآنی آئین کو پورے کا پورا اختیار کرنا ہوگا۔

فَادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (۲/۲۰۸)

اس کا واضح ارشاد ہے۔ "کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لانا اور دوسرے حصے سے انکار کر دینا" ایسا جرم ہے جس کی سزا، اس دنیا کی ذلت و خواری اور آخرت کے عذابِ شدید کی شکل میں ملتی ہے۔ (۲/۸۵) لہٰذا یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ قرآنی آئین کو بطور نصب العین سامنے رکھ کر، اس تک بتدریج پہنچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلامی مملکت کے آئین میں کوئی ایسی شق رکھ لی جائے جو قرآنی اصولوں سے متصادم ہو۔ اس قسم کی ایک شق بھی، سارے کے سارے آئین کو غیر اسلامی بنا دے گی۔

اور اسلامی مملکت کا نظام، اپنے تدریجی مراحل میں ہو یا انتہائی منزل میں، صرف ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہو سکے گا جن کی سیرت خود قرآنی قالب میں ڈھلی ہو۔ بات خالی آئین اور قانون سازی کی نہیں، سیرت سازی کی بھی ہے۔

خریدار صاحبان پرچہ نہ ملنے یا دیر سے ملنے پر خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو۔ (ناظمِ ادارہ)

باسمہ تعالیٰ

پاکستان میں اسلامی قانون کیسے بن سکے گا؟

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پاکستان میں اسلامی قانون

کیسے بن سکے گا؟

جیسا کہ طلوعِ اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے، کسی ملک میں اسلامی نظام (نظامِ خداوندی) کے نافذ ہونے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اس مملکت میں اسلامی ضابطۂ قوانین نافذ ہو۔ "اسلامی ضابطۂ قوانین" سے مراد ہے ایسا ضابطۂ قوانین جسے اُس مملکت کے تمام (مسلمان) باشندے متفق طور پر اسلامی تسلیم کریں اور اس کی اطاعت اسلامی فریضہ سمجھ کر کریں۔ پاکستان کو اس قسم کی مملکت بنانے کے لئے، اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد، یہاں کے علما حضرات نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ مملکت کا اقتدار (یعنی قانون سازی کا اختیار) ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے تاکہ وہ مملکت کے لئے اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کر دیں۔

طلوعِ اسلام کا اجرا ۱۹۳۸ء میں عمل میں آیا تھا، اس مقصدِ وحید کی خاطر کہ ایک خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں نظامِ خداوندی قائم کیا جا سکے۔ یہ مقصد اس کا جزوِ ایمان تھا۔ وہ آج تک مسلسل اس مقصد اور مطالبہ کو دہرائے جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو جائے جسے یہاں کے تمام مسلمان باشندے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کریں، تو اس کی طلوعِ اسلام سے زیادہ اور کس کو خوشی ہوگی؟

جب پاکستان میں علماءِ اسلام نے مذکورہ صدر دعویٰ کیا تو طلوعِ اسلام نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کونسی بنیاد ہے جس کے مطابق آپ اس قسم کا ضابطۂ قوانین مرتب کر دیں گے۔ اس استفسار کی ضرورت اس لئے لاحق ہوئی کہ علماء حضرات کا تعلق مختلف فرقوں سے ہے اور یہ حضرات اپنے اپنے فرقوں پر قائم رہتے ہوئے، ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کر ہی نہیں سکتے۔ ۱۹۵۱ء میں، مختلف فرقوں سے متعلق اکتیس علماء کا ایک اجتماع کراچی میں منعقد ہوا جس میں انہوں نے ایک قرارداد کی رو سے یہ طے کیا کہ مملکت کے قوانین کی بنیاد کتاب و سنت پر ہوگی۔ اس پر ہم نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ کتاب و سنت کی بنیاد پر آپ ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کر سکیں گے، کیونکہ آپ کے ہر فرقہ کے نزدیک "سنت" کا مفہوم ہی الگ الگ نہیں بلکہ اس کا ضابطہ بھی الگ الگ ہے۔

کتاب و سنت

اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا' بجز اس کے کہ انہوں نے طلوعِ اسلام کے متعلق یہ مشہور کر کے کہ یہ منکرِ سنت اور منکرِ حدیث ہے۔ اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ بیس برس تک اسے منکرِ سنت، اور منکرِ حدیث قرار دینے کے بعد، اسلامی نظام کی اقامت، کے سب سے اہم مدعی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ ہ

کتاب و سنت، کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ایشیا۔ بابت ۲۳ اگست ۱۹۷۶ء)

یعنی وہی بات جسے طلوعِ اسلام نے شروع ہی میں کہا تھا اور جس کی بنا پر اسے منکرِ سنت اور کافر و ملحد قرار دیا گیا تھا، بالآخر مودودی صاحب کو بھی کہنی پڑی۔ لیکن انہیں کسی نے "منکرِ سنت" قرار نہ دیا۔

جب مودودی صاحب نے اکتیس علماء کے متفقہ فیصلہ کے علی الرغم (جن میں وہ خود بھی شامل تھے) کہہ دیا کہ "کتاب و سنت" کی رو سے ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا تو سوال پیدا ہوا کہ پھر مملکتِ پاکستان میں کونسا ضابطۂ قوانین نافذ کیا جائے گا۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ چونکہ ملک کے باشندوں کی اکثریت حنفی مسلک سے تعلق رکھتی ہے، اس لئے یہاں فقہ حنفی کو مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کیا جائے گا۔ ان کی اس تجویز کا جواب مختلف فرقوں کے علماء حضرات کی طرف سے کیا ملا، وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ واضح رہے کہ ہمارے ہاں دو بڑے فرقے — شیعہ اور سُنّی ہیں۔ پھر سُنیوں میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ ہیں۔ اہلِ فقہ دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی۔ لیکن یہ دونوں اپنے آپ کو حنفی مسلک کے متبع کہتے ہیں۔ لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مودودی صاحب کی اس تجویز کے خلاف سُنیوں میں سے اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات کا ردِ عمل کیا تھا۔

اہلِ حدیث کی طرف سے مخالفت

اہلِ حدیث حضرات کا ترجمان، لاہور سے شائع ہونے والا، جریدہ، الاعتصام ہے۔ اس کی ۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل مقالہ شائع ہوا ہے:

"نیوٹاؤن۔ کراچی کے مدرسہ عربیہ کا ایک ماہوار مجلّہ ہے، نام "بیّنات" ؎۱ یہ رسالہ اور مدرسہ گو فقہ العراق ؎۲ کے ترجمان ہیں لیکن اس کے نگران حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، علمی حلقوں میں بڑی عزت سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی نظر فقہ اور حدیث دونوں پر ہے۔ ان کے متعلق ہماری رائے یہ تھی کہ وہ اپنے مسلک کی حمایت کے ساتھ اسلام کی عمومی اقدار کا بھی خیال رکھیں گے اور دوسرے سُنّی مسالک کے ساتھ بھی وہ انصاف کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ لیکن "بیّنات" شمارہ ۲ جلد ۳ کا اداریہ دیکھ کر ہماری حیرت کی حد نہ رہی۔ قارئین کرام بھی یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ اتنے اونچے لوگ بھی اس قدر نیچے آ سکتے ہیں اور ایسی سطح کی بات کہہ سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

اس وقت دنیائے اسلام میں ہماری ہی مملکت وہ مملکت ہے جو اسلام کے نام پر مبنی اور اسلامی

؎۱ یہ حنفی مسلک دیوبندی کا ترجمان ہے۔ ؎۲ یعنی فقہ حنفی۔

حکومت کے قیام کے عزم سے قائم ہوئی ہے۔ اس لئے اس کو اسلامی قالب عطا کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہم ہی پر عائد ہوتی ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر عزم صمیم ہو تو یہ کام ایسا دشوار بھی نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے ملک کی اکثریت بلکہ بڑی غالب اکثریت فقہ حنفی کی پیرو ہے اور جمہوری اصول کے ماتحت جب بھی اسلامی حکومت قائم ہو، اسی فقہ کی ترویج ضروری ہوگی، اور یہ وہ فقہ ہے جو نہایت منظم، مدوّن، محفوظ اور ہر عملی پہلو کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس پر صدیوں تک عظیم الشان حکومتیں کامیابی سے چل چکی ہیں۔ اس لئے ہم کو فوری طور پر قانون سازی میں زیادہ وقت لگانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ان قوانین کا نفاذ ہمارا پہلا قدم ہونا چاہیئے۔

بلاشبہ موجودہ معیشت کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہماری قدیم فقہ میں نہیں ملتا۔ اور ان مسائل کو حل کئے بغیر پوری توانائی سے آگے بڑھا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ کام مدونہ قانونِ اسلامی کی تنقید کے ساتھ زیادہ آسانی اور مستعدی سے انجام پا سکتا ہے۔ کیونکہ جب ایک بار فقہ حنفی کی سرکاری حیثیت مسلّم ہو جائے گی، تو لازمی طور پر ان نئے مسائل کا حل اسی روشنی میں تلاش کرنا ہوگا، تاکہ اہلِ ملک کے لئے قابلِ تسلیم ہو۔ اور اس کام کے اہل صرف وہی علماء ہو سکیں گے جو فقہ حنفی کے ماہر ہوں اور جن کے علم و فقہ، اجتہاد اور دیانت پر مسلمانوں کو اعتماد ہو۔ اس طرح موجودہ تحقیقاتی رسہ کشی بھی ختم ہو جائے گی۔ کمیگل اور شکاگو کے تعلیم یافتہ یا قیادت اور صحافت کی راہ سے بنے ہوئے محققین خود بخود میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

"ہم نے یہ ارشاد بار بار پڑھا، اور ہمیں افسوس ہوا۔ اس لئے کہ حضرت مولانا بنوری کی نگرانی میں ملکی اور ملی ضرورت کے متعلق جو کچھ لکھا جائے اس کا معیار اس سے بہت اونچا اور انداز اس سے بہت وسیع ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق تنقیدی گزارش سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آسانی کے لئے اس کا اختصار اور تجزیہ کر لیا جائے۔ اس تجزیہ کے جس حصّہ کا انکار فرمایا جائے، ہمیں اس پر اصرار نہیں ہوگا۔

(۱) یہ ملک اسلامی ہے۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ اس کے نظام کو اسلامی قالب عطا کرے۔

(۲) اور یہ کام اس لئے مشکل نہیں کہ اس ملک کی اکثریت فقہ حنفی کو مانتی ہے۔

(۳) جمہوری اصولوں کے مطابق اس ملک میں فقہ حنفی کی ترویج ضروری ہے۔

(۴) فقہ حنفی کے سہارے پر بڑی حکومتیں چلتی رہیں۔

(۵) معیشت کے نئے مسائل واقعی فقہ حنفی میں نہیں اور ان کے حل کے سوا چارہ بھی نہیں۔

(۶) فقہ حنفی کو اگر سرکاری حیثیت مل جائے تو اسلامی قانون کے نفاذ میں آسانی ہوگی۔

(۷) نئے مسائل کا حل فقہ حنفی کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔

(۸) ان مسائل کے حل کے لئے صرف فقہ حنفی کے ماہرین سے کام لینا چاہیئے۔

یہ بالکل درست ہے۔ یہ ملک اسلامی ہے اور اس میں قوانین کو اسلامی قالب دینا چاہیئے۔ مطالبہ ۱ کے بعد ۲

بالکل بے جوڑ ہے۔ جب ائمہ اربعہ اور ان کی فقہ اور صحابہ اور تمام ائمہ سلف مسلمان ہیں اور وہ سب اسلام کی ترجمانی فرماتے ہیں ـــ تو ـــ پھر اسلام کو سکیڑ کر صرف فقہ حنفی کے قالب میں کیوں بند کر دیا جائے۔ فقہ حنفی صرف ایک مکتبِ فکر ہے جس میں علماء عراق کے خیالات اور اہلِ کوفہ کے تصورات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

۱۹۵۲ء میں دستور کے متعلق جو میٹنگ بتیس (۳۲) علماء کی کراچی میں ہوئی تھی، اس میں دستوری سطح پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ تمام مکاتبِ فکر کو اپنے اپنے نقطۂ نظر کی پابندی کے لئے کھلی اجازت ہوگی۔ حتیٰ کہ سنت کا مفہوم وہی معتبر ہوگا جو اس مکتبِ فکر کے اربابِ حل و عقد کے نزدیک مسلّم ہوگا۔ دستور میں اس قدر توسیع اور گنجائش اور قوانین میں یہ تنگ دلی بے جوڑ سی بات ہوگی۔

جب ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے تو اس میں پورے اسلام کو برسرِ اقتدار رہنا ہے ـــ کسی مکتبِ فکر کو بھی خارج البلد نہیں ہونا چاہیئے۔ اختلاف کی صورت میں قضاۃ اور قانونی عدالتوں کو مخصوص اختیارات دیئے جانے چاہئیں جنہیں وہ استعمال کریں اور مختلف مکاتبِ فکر کے لوگوں میں فیصل خصومات کر سکیں یا مخصوص حالات میں کسی مکتبِ فکر کو ترجیح دے سکیں۔ لیکن ملک پر کسی مکتبِ فکر اور اس کی فقہیات کو مسلّط نہیں کرنا چاہیئے ـــ اگر واقعی اس ملک میں احناف کی اکثریت ہے تو غیر احناف کی اس سے نہ اہمیت کم ہوتی ہے جبکہ ان کو اہمیت حاصل ہے اور نہ ان کی مشکلات کو نظر انداز ہی کیا جا سکتا ہے۔

(۳) دین کے معاملات میں مروّجہ جمہوری اصولوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ ائمہ کی فقہیات کا تعلق دین سے ہے۔ دینی امور کا فیصلہ کبھی مروّجہ جمہوری اصولوں کے ماتحت نہیں کیا گیا۔ اگر کوئی سیاسی مسئلہ ہوتا یا کسی دنیوی نزاع کا رفع کرنا پیشِ نظر ہوتا تو خیر جمہوری اصول زیرِ بحث آ سکتے تھے۔ لیکن ـــ نکاح، طلاق، نماز، وغیرہ ـــ معاملات میں جب شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا ہو تو کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے ضمیر کے خلاف یہ فیصلہ اس لئے قبول کر لے کہ یہ اکثریت کا خیال ہے۔ فقہ حنفی کو قانونی حیثیت تو بڑی بات ہے، اس مطالبہ کا خیال بھی نہیں آنا چاہیئے۔

اکثریت کہاں

آپ فرماتے ہیں، اس ملک میں احناف کی اکثریت ہے۔ میں یہ گزارش کروں گا۔ آپ مختلف طبقات اور ان کے مذہبی خیالات پر نگاہ ڈالیں۔ کیا بریلوی حضرات آپ کے نزدیک یقیناً حنفی ہیں؟ کیا ملک کا عام تعلیم یافتہ طبقہ جس کو ملک کا دماغ کہنا چاہیئے، وہ بھی اکثر ان مصنوعی پابندیوں سے آزاد نہیں؟ اور آزاد رہنا نہیں چاہتا؟

اگر آپ بوقتِ ضرورت بریلوی کو اپنا رفیق تصوّر فرمائیں تو بھی تقلید کے پابند حضرات کچھ زیادہ نہیں ہوں گے۔ ویسے مذہب کے معاملہ میں ایسا تعامل آپ حضرات کے لئے مناسب بھی نہیں ہوگا۔ اکثریت کے شوق میں حنفیت کو بھی خطرے میں نہ ڈال دیں۔ پھر یہ اکثریت کی پناہ، دین میں واقعی اگر اصول کا مقام رکھتی ہو تو کیا فقہ کے مسائل کی چھان پھٹک بھی اس اصل کے ماتحت ہو سکتی ہے؟ کیا جن مسائل میں حضرت امام ابوحنیفہؒ جمہور کے خلاف ہوں، وہاں حضرت امامؒ کا مسلک ترک کر دیا جائے اور جمہور کے مسلک کو ترجیح دی جائے؟ جہاں ائمہ ثلاثہ حضرت امامؒ کے خلاف ہوں، وہ بھی ترک کر دیئے جائیں اور جہاں حضرت

امامؒ کے تلامذہ حضرت امامؒ سے اختلاف فرمائیں انہیں خیرباد کہہ دیا جائے۔

فقہ حنفی اور حکومتیں

مولانا! پچھلی تاریخ پر غور فرمائیں۔ آیا واقعی جو بڑی بڑی حکومتیں مذہباً حنفی تھیں، وہ فقہ حنفی پر چلتی بھی رہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ حکومتیں اپنے مادی اسباب، اور قوت کے سہارے چلتی رہی ہیں۔ یعنی چلنے کی اصل وجہ قوت تھی ـــ فقہ نہ تھی۔ بلکہ ایسے واقعات آپ کو تاریخ میں ملیں گے کہ جب کوئی فقہ یا کوئی فقیہہ حکومت کی خواہشات کی راہ میں حائل ہوا تو اُسے زور بازو سے ہٹا دیا گیا۔

پھر کسی فقہ کے سہارے پر کسی حکومت کا چلنا، اس کی صداقت یا صحت کا ثبوت نہیں۔ پورے یورپ میں "لادینی فقہوں" کے سہارے پر بڑی بڑی بادشاہتیں چل رہی ہیں۔ رومن فقہ اور کمیونزم کی فقہ دونوں دو بڑے عظیم الشان ملکوں کے قانون کی اساس ہیں۔ ان ملکوں میں مادی قوتوں کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان "فقہوں" کے تقاضوں کو قبول کریں ـــ یہ کوئی دلیل نہیں۔ کوئی فقہ ہو جس کی سرپرستی حکومت کرے وہ نظام اسی سرپرستی کے سہارے پر چلے گا۔ یہ فقہ کی خوبی نہیں سرپرست کی خوبی کہی جا سکتی ہے۔

پھر یہ فقہ حنفی پر کیا موقوف ہے، ائمہ اربعہ کی فقہوں کے اعتماد پر کئی حکومتیں چلتی رہیں۔ حجاز، مصر، یمن، خراسان، وغیرہ ممالک میں شافعی حکومت رہی ـــ الجزائر، بربر اور مغرب کے کئی ممالک میں سلفی الخیال حکومت کرتے رہے۔ اندلس پر مالکی اسی طرح حکومت کرتے رہے جس طرح کئی سال ہندوستان اور افغانستان پر حنفی حکومت کرتے رہے۔ ایران پر مدت سے روافض حکومت کر رہے ہیں ـــ یہ حق کے لئے کہاں تک دلیل ہو سکتی ہے؟ ـــ یہ معلوم نہیں کہ جن ممالک پر حنفی فقہ کے تعاون سے حکومت ہوتی رہی، ان ممالک میں دوسرے مکاتب فکر کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا گیا ہے۔ جبراً ان پر فقہ حنفی ٹھونسی گئی یا ان کو ان کی صوابدید کے مطابق عمل میں مراعات دی گئیں۔ اور آپ حضرات کی طرح درخواست کر کے فقہ حنفی کو مسلط کیا گیا۔

متوازن مشورہ

ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس ملک میں پورے اسلام کو موقع ملنا چاہیئے۔ تمام مکاتب فکر کھلے طور پر اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور لوگ آزادی سے جس مسئلہ میں چاہیں، جس مکتب فکر کو پسند کریں اسے اپنا لیں، اس پر عمل کریں اور کوئی تعصب نہ ہو۔ اس لحاظ سے یہ ملک دنیا کے لئے مثالی ہو کہ اس میں کسی عصبیت کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ (الاعتصام کا مقالہ ختم ہوا)"

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کی اس تجویز کی، کہ ملک کا قانون فقہ حنفی ہونا چاہیئے، اہل حدیث حضرات کی طرف سے کس شدت سے مخالفت ہوئی۔ لیکن جس طرح مودودی صاحب کو اعتراف کرنا پڑا تھا کہ "کتاب و سنت" کی بنا پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے، اسی طرح اہل حدیث حضرات نے بھی تسلیم کیا کہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے

اس کا حل یہ بتایا کہ :-

اس ملک میں پورے اسلام کو موقع ملنا چاہیئے۔ تمام مکاتبِ فکر کھلے طور پر اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور لوگ آزادی سے جس مسئلہ میں چاہیں جس مکتبِ فکر کو پسند کریں اسے اپنا لیں۔ اس پر عمل کریں اور کوئی تعصب نہ ہو۔ اسی لحاظ سے یہ ملک دنیا کے لئے مثالی ہو کہ اس میں کسی عصبیت کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔

آپ سوچئے کہ دنیا میں کوئی ایسی مملکت، ایک دن کے لئے بھی قائم رہ سکتی ہے، جس میں ایک ضابطہ، قوانین نہ ہو، بلکہ لوگ جس قانون پر چاہیں عمل کریں۔ اس سے بڑھ کر (ANARCHY) کی کوئی اور مثال بھی ہو سکتی ہے؟

فقہ حنفی خود مودودی صاحب کے نزدیک

اس کے بعد آیئے، شیعہ حضرات کے ردِّ عمل کی طرف۔ لیکن اس سے پہلے آپ یہ بھی دیکھتے جایئے کہ جس فقہ (حنفی) کو مودودی صاحب نے مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کرنے کی تجویز فرمائی تھی، اس فقہ کے متعلق خود مودودی صاحب کے خیالات کیا ہیں؟ وہ اپنی تالیف، رسائل و مسائل حصہ اوّل (۱۹۵۱ء ایڈیشن) میں لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ اور کہتے ہیں۔

(صفحہ ۷۵ - ۲۷۴)

وہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:-

جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنتِ رسولؐ روشن ہو جائے، اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی مرتبہ کا شخص ہو۔ (تفہیمات - حصہ اوّل صفحہ ۳۲۵)

حنفی مسلک کا مدار تقلید ائمہ فقہ پر ہے۔ اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

میرے نزدیک ایک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید، ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (رسائل و مسائل - حصہ اوّل - صفحہ ۲۴۲)

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا ایک مجتہد کا فیصلہ، ہمیشہ کے لئے واجب العمل ہو سکتا ہے، وہ فرماتے ہیں:-

یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علمِ الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے اس لئے اس کے احکام تمام ازمنہ و احوال کے لئے مناسب ہوتے ہیں مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان و مکان کی تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و

احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا، اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم صفحہ ۳۲۶ - ۱۹۵۱ء ایڈیشن)

فقہ حنفی میں اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اسے مودودی صاحب، وہ جامد، اور بے روح مذہبیت قرار دیتے ہیں جسے آجکل اسلام کہا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ:۔

> اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کی بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

یہ ہیں اس فقہ حنفی کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات جسے وہ ملک کا قانون بنانا چاہتے ہیں اور جس کی سند، وہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت اس کی حامل ہے۔ اس سند (یعنی اکثریت کے مسلک کے برسرِ حق ہونے) کے متعلق بھی مودودی صاحب کا فیصلہ سُن لیجئے۔

> بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے۔ اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ ہمیشہ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی، جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن یہ ارشادِ نبویؐ کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبیؐ نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو، جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم سے کم اتنی واقفیت ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۴۸)

آپ نے غور فرمایا کہ "اکثریت" کی تعریف (DEFINITION) کو اس طرح سمٹا کر، مودودی صاحب قانون سازی کے اختیارات کو کس مقام پر لے گئے ہیں! بہرحال، یہ ضمنی نکتہ تھا۔ اب آگے بڑھیے اور

شیعہ حضرات کا ردِ عمل

یہ دیکھئے کہ شیعہ حضرات کا اس تجویز کے خلاف ردِ عمل کیا تھا۔ اس سلسلہ میں "ادارہ تحفظِ حقوقِ شیعہ" کے صدر، سید اظہر حسین زیدی، نے ایک بیان شائع فرمایا، جو روزنامہ مساوات بابت ۱۹ راگست ۱۹۷۷ء میں چھپا تھا۔ وھو ھذا:۔

> "مرکزی ادارۂ تحفظِ حقوقِ شیعہ کے صدر سید اظہر حسین زیدی نے امیرِ جماعتِ اسلامی مولانا مودودی کے آئین کے بارے میں حالیہ بیان کی پُرزور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مودودی نے اہلِ تشیع کو جو ایک مسلمہ مسلمان فرقہ ہیں، اسلام کے دائرے سے نکال کر عیسائیوں، اچھوتوں اور دوسری غیر مسلم اقلیتوں کی صف میں کھڑا کر کے شیعہ مسلمانوں کی توہین کی ہے۔ سید اظہر حسین زیدی ایک پریس کانفرنس سے مخاطب تھے۔ انہوں نے کہا کہ چند ہفتے پیشتر میں نے تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کو مراسلے بھیجے تھے کہ اب جبکہ آپ سوادِ اعظم کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مل کر ملک میں خلافتِ راشدہ کا نظام

لانا چاہتے ہیں تو ایسے نظام میں مسلّمہ اسلامی فرقہ شیعہ جو کتاب و سنت کے معانی تعلیمات محمدؐ و آلِ محمدؐ سمجھتا ہے اور پاکستان کے حصول اور تعمیر میں سوادِ اعظم کے ساتھ برابر کا حصّہ دار ہے۔ اس کے مذہبی اور سیاسی جذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے اسے کس طرح نمائندگی دی جائے گی۔

انہوں نے کہا کہ اس خط کے جواب میں مولانا مودودی نے جو آئینی خاکہ پیش کیا ہے اس کی رُو سے عام ملکی نظام کتاب و سنت کی تعبیر پر بنے گا جسے اکثریت مانتی ہو اور اکثریت کتاب و سنت سے مراد خلافتِ راشدہ کا نظام سمجھتی ہے جس میں شیعہ شریک نہیں۔ اس اصول کے تحت وہی شخص صدرِ مملکت ہو سکتا ہے جو خلافتِ راشدہ کا قائل ہو۔

انہوں نے کہا کہ مولانا شاید بھول گئے ہیں کہ پاکستان کے حصول کے لئے جدوجہد میں شیعہ فرقے کے مسلمان برابر کے شریک رہے ہیں اور انہوں نے یہ ملک اس لئے نہیں بنایا تھا کہ ان کا "پرسنل لاء" محفوظ ہوگا۔ پرسنل لاء تو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت کے بھی محفوظ ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا مودودی نے اپنے بیان کے جواز میں مراکش، ایران، انڈونیشیا اور ملایا کی مثالیں دی ہیں۔ لیکن موصوف کو معلوم ہونا چاہئیے کہ ان کا معاملہ پاکستان سے بالکل مختلف ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر مولانا مودودی لبنان کی مثال دیتے تو شاید قابلِ غور سمجھی جاتی۔ وہاں عیسائی اور شیعہ اور سُنّی مسلمانوں نے مل کر فرانسیسیوں سے اقتدار چھینا اور ایک ملک بنایا اور اس کے آئین میں اکثریتی فرقہ کا صدر، سُنّی وزیرِ اعظم اور شیعہ سپیکر کا انتخاب ضروری قرار دیا گیا۔ اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی متحدہ جدوجہد سے انگریز سے اقتدار چھینا اور پاکستان بنایا۔ لہٰذا اس نسبت سے اقتدار میں بھی شیعہ فرقہ کا عمل دخل ہونا چاہئیے۔

انہوں نے کہا کہ مولانا مودودی جو اسلام کی نمائندگی کے دعویدار ہیں وہ اس سے بھی باخبر ہیں کہ شیعہ مسلمان اسلامی فرقہ ہے اور سوادِ اعظم کے دوش بدوش پاکستان کے لئے ان کی قربانیاں کسی سے کم نہیں۔ لہٰذا، جو بھی نظام یہاں پر رائج ہوگا، شیعوں کو اس میں مذہبی ملکی اور شخصی تحفظ دینا ہوگا، انہوں نے کہا کہ فقہی مسائل اور عبادات کا تحفظ تو غیر مسلموں کو بھی حاصل ہے۔ لہٰذا مولانا مودودی شیعوں کو سوادِ اعظم کی سطح پر رکھیں نہ کہ ہندوؤں، سکھوں، اچھوتوں اور عیسائیوں جیسے غیر مسلم اقلیتوں کے برابر سمجھیں"۔

اسی ادارہ کے ایک اجلاس میں حسبِ ذیل قرارداد بھی منظور کی گئی۔

"شیعانِ پاکستان کسی ایسے پرسنل یا پبلک لاء کو تسلیم نہیں کریں گے جس میں اہلِ تشیع کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حقوق کے تحفظ کی مکمل ضمانت نہ دی گئی ہو۔ اس عزم کا اظہار آج ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان کے اجلاس میں . . . . . . ایک قرارداد کے ذریعے کیا گیا۔ یہ اجلاس آج باغ بیرون موچی دروازہ میں مولانا سید [illegible] زیدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ایک اور قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ اسمبلیوں کے انتخابات کے طریق کار میں ترمیم کر کے ایسے قانون کو نافذ کیا جائے جس میں شیعہ فرقہ کو اسمبلیوں میں مناسب نمائندگی دی جائے۔ ان قراردادوں کی تائید میں [illegible] مظفر علی شمسی، مولانا سید [illegible] علی شاہ، مولانا ظفر الحسن، مولانا خواجہ حسین بخاری، ڈاکٹر سید ریاض حسین اور ڈاکٹر

سید خادم حسین نے بھی تقاریر کیں۔" (روزنامہ مساوات۔ مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۷۰ء)

علاوہ ازیں ادارۂ فلاحِ ملت (حیدر آباد) کے کنوینر، سید محمد رضا رضوی صاحب نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان تھا "آئینِ اسلامی اور مسلمہ اسلامی فرقے" اس میں انہوں نے مودودی صاحب کی تجویز کی مخالفت کرنے کے بعد لکھا:۔

اگر سوادِ اعظم کے رہنماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی۔

پاکستان میں قانون سازی کے سلسلہ میں، یہاں کے مختلف معروف فرقوں کے خیالات آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ آجکل یہ کہا جا رہا ہے کہ "نظامِ مصطفےٰ" کے قیام کے مطالبہ میں تمام فرقوں کے متبعین شامل ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس کے بعد، اگر انہی فرقوں کے نمائندے مملکت کے لئے قانون سازی کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے پارلیمان میں بیٹھے تو کیا یہ ممکن ہوگا کہ یہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر لیں جسے یہ سب متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں! ان حضرات کے جو عقائد اور خیالات آپ کے سامنے آ چکے ہیں، ان کے پیشِ نظر ایسا قطعاً نہیں ہو سکے گا! اُس وقت اس ایوان میں کیا ہوگا، اس کے متعلق ہم سے نہیں، اپنی چشمِ تصوّر سے پوچھئے!

لیکن ہمارے نزدیک اس سوال کو چنداں اہمیت حاصل نہیں کہ ——— اُس وقت ان میں کس قدر باہمی سر پھٹول ہوگا، اگرچہ یہ امر از حد افسوسناک ہوگا۔ ہمارے نزدیک اہمیت اس سوال کو ہے کہ جب ان کے اختلافات کی بنا پر، مملکت کے لئے کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا تو سیکولر نظام کے حامیوں ——— مغرب زدہ نوجوانوں اور سوشلزم اور کمیونزم کے حمایتیوں ——— کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ اب دنیا میں اس کی بنیادوں پر کوئی مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔

مایوسی کی کوئی بات نہیں

اس سے ان لوگوں کے دل پر جو اس ملک میں نظامِ خداوندی کے قیام کو دیکھنے کے لئے جی رہے ہیں، جو قیامت گزرے گی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لیکن ہم ان حضرات کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ اس سے مایوس نہ ہوں۔ یہ اسلام کی ناکامی کا ثبوت نہیں ہوگا۔ یہ ثبوت ہوگا ان حضرات کے غلط مسلک کی ناکامی کا۔ اسلام تو زندہ جاوید دینِ خداوندی ہے جو کبھی ناکام رہ ہی نہیں سکتا۔ اس دین کی رو سے اسلامی حکومت ہر زمانے میں قائم ہو سکتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ:۔

مختلف فرقوں کے مسلمان، اپنے اپنے فرقہ کی فقہ سے صرفِ نظر کر کے، قرآن کریم کی بنیادوں پر، حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں، ایک جدید فقہ مرتب کریں جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو۔

یاد رکھئے، مختلف فرقوں کے اختلافات کے باوجود، ایک چیز ایسی ہے جس پر ان سب کا ایمان ہے جو ان سب کے نزدیک قدرِ مشترک ہے۔ اور وہ ہے خدا کی کتاب۔ قرآن کریم ——— اور جہاں اور جس نے بھی قرآن کریم کو قانون سازی کیلئے آخری سند اور حجت تسلیم کر کے، اس عقیدہ کو عملی حیثیت دے دی، ایک ایسا ضابطۂ قوانین وجود میں آ جائے گا جو سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے۔ جس مملکت میں وہ ضابطۂ قوانین نافذ ہوگا، اس کو اسلامی مملکت کہلانے کا حق ہوگا۔ اور بعونہٖ تعالےٰ پاکستان میں زود یا بدیر ایسا ہو کر رہے گا۔

———

حقائق و عبر

۱۔ نظامِ مصطفیٰؐ کیا ہے؟

نوائے وقت، بابت ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء میں، سید اسعد گیلانی صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: "نظامِ مصطفیٰؐ کیا ہے؟" انہوں نے پہلے یہ بتایا ہے کہ اسلام کے دانا دشمنوں نے اس نظام کی کس قدر بھیانک تصویر پیش کی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ اس کے نادان دوستوں نے اس کا نقشہ کس قسم کا کھینچا ہے۔ اس ضمن میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اسلام کے نادان دوستوں نے اور بھی ستم ڈھایا۔ انہوں نے اسلام کے خلاف اندر کی غلط گواہی پیش کی۔ ان میں سے بیشتر اسلامی حکومتوں کے دور میں مرتب کردہ نصابِ قانون کے فقہی ساز تھے جو اسلام کو بحیثیت نظامِ زندگی نہ جانتے تھے بلکہ اس کے قانونِ فوجداری اور دیوانی کے ماہرین تھے۔ ان کے پاس محض ضوابط حدود اور وراثت کے مسائل اور مسلمان حکومتوں میں عدالتی فیصلوں کے چارٹ تھے۔ وہ ہر مسئلے کو قانون سزا اور احتساب کی نظر سے ہی دیکھتے تھے۔ مسلمان حکومتوں کے زوال کے بعد اسلامی نظامِ تعلیم کے نام سے مسلمانوں کا یہی فوجداری اور دیوانی نظامِ قانون باقی رہ گیا اور وہ بدلے ہوئے حالات سے بے نیاز اسی نظامِ قانون کو حالات ماحول اور فضا سے بے نیاز ہو کر اسی انداز میں بیان کرتے رہے۔ گویا اسلامی نظام کی ساری فضا، سارا اخلاق اور سارے رفاہی ادارے تو موجود تھے بس اس کا قانونِ فوجداری ہی نافذ کرنے کی دیر تھی کہ اسلامی نظام کی بہار پورے معاشرے میں ہر طرف لہریں لینے لگے گی چونکہ یہی حضرات اپنی اس ناکافی تعلیم، محدود نگاہ، حالاتِ حاضرہ سے بے خبر دل و دماغ کے ساتھ اسلام کی نمائندگی کرتے۔ اس کے قوانین کے از سرِ نو اجرا کا مطالبہ کرتے اور اسلامی دور کے گن گاتے تھے۔ اس لئے فطری طور پر اسلامی نظام یا نظامِ مصطفیٰؐ کی حقیقی تعبیر کے مفسر انہیں کو قرار دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطبوں، دعظوں، تقریروں اور بیانوں میں جو اسلامی نظام کا نقشہ پیش کیا وہ بڑا ہی بھیانک نقشہ ہے۔ اگرچہ وہ اپنے ذہن اور نفسیات کے مطابق اسلام کی خدمت اور تبلیغ ہی کرتے تھے لیکن اسلام کی رحمت اور برکات سے ناواقف لوگ ان کے سزاؤں سے معمور وعظ اور بیانات سن سن کر تھر تھر کانپتے تھے اور انہیں اپنی پیٹھوں پر بات بات پر کوڑے برستے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

اسلام کے ان نادان دوستوں نے اسلامی نظام یا نظامِ مصطفیٰؐ کی جو تصویر پیش کی وہ یہ تھی کہ امر بالمعروف

کے محکمے کے تحت ڈنڈہ بردار اور کوڑے مار مشرّع کارکنوں کا ایک جتھ گلی گلی پھرے گا۔ جس کا ٹخنہ ننگا نہ پائے گا اس کے ٹخنے پر ڈنڈے پڑیں گے۔ جو نماز میں لاپروائی کرے گا اسے جوتے مار مار کر نماز پڑھائی جائے گی۔ جس کی ڈاڑھی نہ ہوگی اس پر سنّتِ رسول ؐ کی خلاف ورزی کے جرم میں کوڑے برسیں گے۔ چوروں کی قطاریں ہاتھ کٹوانے علیحدہ کھڑی ہوں گی۔ زانیوں کو دوسری طرف سنگسار کیا جا رہا ہوگا۔ شرابی کسی اور چوراہے میں پٹ رہے ہوں گے۔ نوجوانوں اور بے پردہ عورتوں کو پکڑ پکڑ کر ہر چوراہے میں ان کے سر مونڈے جا رہے ہوں گے۔ بے پردہ عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر گھروں میں بند کیا جا رہا ہوگا۔ جا بجا ٹکٹکیاں لگی ہوں گی، مجرم ان پر ٹنگے ہوئے کوڑوں کی مار کھا رہے ہوں گے —— اور دہشت زدہ عوام کا ہجوم ہاتھوں میں تسبیاں لئے اندر ہی اندر خوف زدہ یہ سارے مناظر دیکھ رہا ہوگا، مٹھائی کی دکانیں بند کر کے صرف حلوے کی دکانیں کھلی رکھی جائیں گی۔ عدالتوں کا کام صرف لوگوں کو کوڑے لگوانا اور ہاتھ کٹوانا ہوگا۔ باقی کام واجبی سا ہوگا۔"

اس نقشہ کا ایک گوشہ خالی رہ گیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر یہ نامکمل رہ جاتا ہے۔ محترم گیلانی صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ اسے بھی اپنے پیش کردہ نقشہ میں شامل کر لیں۔ وہ یہ ہے:۔

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخِ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ، اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔

("مرتد کی سزا" از ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ اگست ۱۹۵۳ء۔ ایڈیشن ص۷۶)

اسعد گیلانی صاحب، جماعت اسلامی کے ایک ممتاز رکن ہیں، اس لئے انہیں اس نقشہ کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہونا چاہیئے۔ نہ ہی اسے اپنے نقشہ میں شامل کرنے پر کوئی اعتراض۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس نقشہ کے مرتب کا شمار اسلام کے دانا دشمنوں میں کریں گے یا نادان دوستوں میں۔

——— ⁂ ———

۲۔ مذہبی آزادی

روسی سفارت خانہ (متعینہ کراچی) کی طرف سے ایک گشتی خبرنامہ موصول ہوا ہے جس کے ساتھ ایک مقالۂ خصوصی بھی منسلک ہے جس کا عنوان ہے —— سوویت یونین میں تمام مذاہب کو مکمل آزادی حاصل ہے —— اس میں انہوں نے لکھا ہے:۔

سوویت یونین میں مسلمانوں کی انجمنوں کی بڑی تعداد کا تعلق سنّی فرقے سے ہے۔ وہاں مساجد میں روزانہ نماز علاوہ، مگر علاوہ جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے اور عید کی نمازیں بھی ہوتی ہیں۔ مسلمان اپنی

عیدیں بڑے ہی اہتمام سے مناتے ہیں۔ عید کے دن ہزاروں مسلمان مساجد میں جمع ہوتے ہیں ماسکو کی مسجد میں عید کے موقع پر عموماً پانچ ہزار سے زیادہ مسلمان نماز ادا کرتے ہیں..... سوویت یونین کے مسلمان اپنے عقائد کے مطابق سادی مذہبی رسمیں ادا کرتے ہیں۔ مثلاً عقیقہ، شادی اور غازہ جنازہ وغیرہ..... مسلمان خاندانوں میں شادیاں اسلامی عقائد کے مطابق انجام پاتی ہیں۔ سوویت یونین کے مسلمان فریضۂ حج بھی ادا کرتے ہیں..... سوویت یونین کے مدرسوں اور مسلم اکیڈمی میں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے..... مسلم بورڈوں کی طرف سے جنتریاں اور فتوے شائع کئے جاتے ہیں۔

اس قسم کی تفاصیل کے بعد آخر میں لکھا ہے:۔

مذاہب کو مکمل مساوات حاصل ہے اور انہیں عبادت کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ ان کی عبادت گاہوں کے تقدس کی ضمانت دی گئی ہے۔ مذہبی زندگی کے تعلق سے انہیں مکمل آزادی حاصل ہے۔ یہ چیز اس اصل کے عین مطابق ہے کہ سوویت یونین میں ریاست کو مذہب سے علیحدہ کیا دیا گیا ہے۔

آپ ہمارے ہاں کے علمائے کرام سے پوچھئے۔ وہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ اس قسم کی مذہبی آزادی سے اسلام کے تقاضے پورے نہیں ہو جاتے۔ اسلام میں مذہب کو ریاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہی علماء حضرات تحریکِ پاکستان کے دوران کیا فرمایا کرتے تھے؟ وہاں کا ہندو، مسلمانوں کو اس قسم کی پوری مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا تھا جس کا ذکر روسی سفارت خانہ کے مقالہ میں کیا گیا ہے۔ (بجز ان چند حضرات کے جو مسلم لیگ کے ہم نوا تھے) یہ تمام علماء حضرات (جنہیں نیشنلسٹ علماء کہا جاتا تھا اور جو بالعموم دیوبند سے متعلق تھے) یہ کہتے تھے کہ مذہب کی اس قسم کی آزادی کے بعد، اسلام کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے مسلم لیگ کا علیحدہ مملکت کا مطالبہ اسلام کا تقاضا نہیں۔ ان کے برعکس علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کا موقف یہ تھا کہ اسلام محض عقائد، عبادات یا رسومات کی آزادی کا نام نہیں۔ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے میں قوانین خداوندی کے نفاذ کا نام ہے اور یہ مقصد اپنی آزاد مملکت کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ آپ اس بحث کو دیکھئے جو دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبال (مرحوم) کے مابین ۱۹۳۸ء میں چھڑی تھی اور جسے حضرت علامہؒ نے "معرکۂ دین و وطن" کہہ کر پکارا تھا۔ یہ علماء حضرات آخری وقت تک مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد ہجوم کر کے اس طرف آ گئے۔ اور اب یہ اس مطالبہ میں پیش پیش ہیں کہ مذہب کو ریاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ مذہب کا ان کے ذہنوں میں اب بھی وہی تصور ہے۔ یہ عبادات۔ رسومات۔ مناسک اور شخصی قوانین کو اب بھی ریاست سے الگ رکھ کر، ہر فرقہ کو ان کی آزادی اسی طرح دینا چاہتے ہیں جس طرح سوویت یونین یا انڈیا والے دے رہے ہیں۔ باقی

رہے پبلک لاز، تو جیسا کہ آپ طلوعِ اسلام میں شائع ہونے والے مقالات سے دیکھ رہے ہیں، ان کا کوئی ایسا ضابطہ، ان حضرت سے بن نہیں سکے گا جسے یہ سب متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں، اس وقت، یہ حضرات اس مملکت میں وہی نظام رائج کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے جو بھارت میں رائج ہے۔ اور اس طرح نہایت فخر و مسرت سے کہیں گے کہ دیکھا! تاریخ نے کس طرح ثابت کر دیا کہ مسلک وہی درست تھا جسے مولانا مدنی (مرحوم) اور ان کے ہم نوا نیشنلسٹ علماء پیش کرتے تھے۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا مسلک درست نہیں تھا۔

باب المراسلات

ٹیلی ویژن کے ناپاک ہو جانے کا خطرہ

اکثر حضرات ہم سے پوچھا کرتے ہیں۔ اور ان پوچھنے والوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے ——— کہ اس دور میں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن مؤثر ترین ذرائع ابلاغ ہیں۔ ہمارے ہاں کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے انواع و اقسام کے پروگرام نشر ہوتے ہیں جن میں بیشتر لغویات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ سنجیدہ پروگراموں میں بھی جن خیالات اور نظریات کا اظہار ہوتا ہے وہ بالعموم اسلام کی بڑی غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔ (اس کے بعد یہ حضرات ہم سے پوچھا کرتے ہیں کہ) جو قرآنی فکر، پرویز صاحب پیش کرتے ہیں، وہ تاریکیوں کو روشنی میں بدل دیتا ہے۔ وہ اس قرآنی فکر کو ان ذرائع ابلاغ سے نشر کیوں نہیں کرتے!

ہم، خدا کے ان سادہ دل بندوں سے ان کے اس استفسار کے جواب میں اتنا کہہ کر خاموش ہو جانا مناسب سمجھا کرتے ہیں کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کوئی شخص از خود جا کر اپنے خیالات نشر نہیں کر سکتا۔ ان پروگراموں میں وہی لوگ شریک ہو سکتے ہیں جنہیں ان ذرائع کے ارباب نظم و نسق دعوت دیں۔ اس کے بعد وہ پوچھا کرتے ہیں کہ یہ حضرات، پرویز صاحب کو دعوت کیوں نہیں دیتے! اس قسم کے استفسارات کا جواب دینے میں ہمیں جو دشواری پیش آتی ہے، ہمارے ایسے اس مراسلہ نے دور کر دیا، جو ہمیں کراچی کی محترمہ خاتون، مسز رضا علی (بلند اختر) صاحبہ کی طرف سے موصول ہوا ہے اسے غور سے پڑھئے:۔

"میں ۵ رجولائی ۱۹۷۷ء کو اتفاق سے کوئٹہ میں تھی، اور ٹیلی ویژن والوں کی طرف سے موصول ہونے والی دعوت کی بنا پر، کسوٹی کی اس محفل میں شریک جو اسی شام وہاں کے ٹیلیویژن

اسٹوڈیو میں منعقد ہوئی۔ متعینہ پروگرام کے بعد کچھ وقت بچ گیا تو انہوں نے حاضرین میں سے کسی کو ایک سوال پوچھنے کی دعوت دی۔ میں نے وہ سوال پوچھا۔ سوال شخصیت کے متعلق تھا۔ جواب دینے والے (محترم عبیداللہ بیگ اور افتخار عارف صاحب) ابتدائی معلومات کے فوری بعد (غالباً آٹھویں یا نویں سوال پر) حرف تک پہنچ گئے۔ ان کا آخری سوال یہ تھا کہ کیا یہ وہ عالم ہیں کہ جو غلط باتیں اسلام میں داخل ہو گئی ہیں، یہ ان کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے بلا تامل محترم پرویز صاحب کا نام لے دیا، جو بالکل درست تھا۔ انہوں نے کہا کہ پرویز صاحب کی شخصیت ان کے لئے اجنبی نہیں۔ انہوں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے خیالات سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ انہوں نے پرویز صاحب کا ذکر بڑے ادب اور احترام کے ساتھ کیا۔ اور سامعین نے یہ سب کچھ سنا۔ پروگرام کے بعد میں نے مہتمم صاحب سے کہا کہ میں کسوٹی میں تحفتہ دینے کے لئے پرویز صاحب کی کچھ کتابیں بطور عطیہ پیش کرنا چاہتی ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ وہ ارباب اختیار (انفارمیشن) سے دریافت کر کے مجھے مطلع کریں گے۔ ابھی تک ان کا جواب موصول نہیں ہوا۔

۵ جولائی کا کوئٹہ کا پروگرام، ۲۵ جولائی کو کراچی ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا — اس میں باقی سارا پروگرام بعینہٖ موجود تھا لیکن میرے سوال اور اس کے جواب کا حصہ، بالکل حذف کر دیا گیا تھا۔ اس سے مجھے بے حد قلق ہوا۔ آپ کسوٹی کے پروگراموں کو دیکھئے۔ ان میں کافروں، مشرکوں۔ ملحدوں۔ بے دینوں۔ دھریوں تک کے متعلق سوالات پوچھے اور جواب دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ تمام پروگرام من و عن دکھائے جاتے ہیں۔ انہیں کبھی حذف نہیں کیا جاتا۔ لیکن جس شخص کی ساری زندگی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں گذری ہے، اس کا ذکر ٹیلی ویژن میں برداشت نہیں کیا جاتا۔ بہرحال میں نے کوئٹہ ٹیلی ویژن کے اسٹیشن ڈائرکٹر کو خط لکھا ہے کہ وہ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ پروگرام کے اس حصہ کو حذف کیوں کر دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے اس کا کوئی جواب ابھی تک موصول نہیں ہوا۔

میں بھی ان میں سے ہوں جو آپ سے اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے پرویز صاحب کی قرآنی فکر کیوں نشر نہیں کرائی جاتی۔ مجھے اپنے استفسار کا جواب اس واقعہ سے مل گیا ہے۔ یہ خط اس لئے لکھ رہی ہوں کہ آپ اسے طلوع اسلام میں شائع کر دیں تاکہ میری طرح کے دیگر استفسار کرنے والوں کو بھی، ان کے سوال کا جواب مل جائے۔"

اس "المیہ" پر ہمیں اپنی محترمہ بہن سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ دراصل غلطی خود ان کی اپنی ہے جو انہوں نے اکبر (مرحوم) کی اس تنبیہہ پر کان نہ دھرا کہ: ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا، اس زمانے میں!

شعبۂ ٹیلی ویژن کے جس صاحب مجاز نے اس پروگرام کو حذف کر دیا، ہمارا خیال ہے کہ انہیں اسلامی مملکتِ پاکستان کی طرف سے، ان کی اس خدمتِ جلیلہ کا صلہ ملے ہوگا کہ انہوں نے ٹیلی ویژن جیسے مقدس ذریعۂ ابلاغ کو قرآنی ذکر سے "ناپاک" ہونے سے بر وقت بچا لیا! ویسے اگر آپ ان صاحب سے دریافت کریں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ انہوں نے پرویز صاحب کی قرآنی فکر تو ایک طرف ان کی کسی تحریر کا ایک لفظ تک بھی پڑھا نہیں ہوگا۔ اور وہ محض "ایمان بالغیب" کی رو سے اس "عملِ صالح" کے مرتکب ہو گئے ہوں گے —— اور اس قسم کا "ایمان بالغیب" تو آپ جانتے ہیں، بڑی قدر افزائی کا مستحق ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ ان کا یہ عمل شرفِ قبولیت حاصل کرے۔ باقی رہی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت! تو اس کے لئے مَعطیٔ فطرت نے ایسے ایسے ذرائع ابلاغ مہیا کر رکھے ہیں جن تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا ؎

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند   بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

لاہور میں ہر جمعہ ۸½ بجے صبح (فون ۸۰۸۰۰) ۲۵/بی - گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)	**کمالیہ** میں ہر جمعہ ۳½ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) (لائلپور) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بالمقابل چکی) اقبال بازار
لیہ میں ہفتہ کے دن بعد نماز مغرب کیپٹن غلام حیدر خان کے مکان (نمبر ۱۵۳ وارڈ ۷) واقع عقب پائلٹ گرلز ہائی سکول (بذریعہ ٹیپ)	**جام پور** میں ہر جمعہ بعد نماز عشاء (بذریعہ ٹیپ) (ڈیرہ غازیخاں) بلوچ جنرل اسٹور - اڈہ روڈ
کراچی میں (عارضی طور پر) ہر جمعہ ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کمرہ نمبر ۲۰ ماسٹر مینشن بالمقابل میری ویدر ٹاور ایم اے جناح روڈ۔	**ملتان** میں ہر جمعہ صبح ۹ بجے (بذریعہ ٹیپ) (فون ۷۲۰۷۱) دفتر شاہ سنز - بیرون پاک گیٹ
لائلپور میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) (فون ۲۴۹۳۴) ۶۵ کوتوالی روڈ - حیات ہومیو کلینک	**گجرات** میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار چار بجے شام بمقام ۱/۱/۱۲ بی - لمبیر روڈ (بذریعہ ٹیپ)
راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶ لیاقت روڈ۔	**جلالپور جٹاں** میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) (گجرات) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

شہدائے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یاد میں

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملّتِ ما سازگار آمد

[جس طرح ۱۴ اگست (۱۹۴۷ء) کا دن ہماری تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح ۶ ستمبر (۱۹۶۵ء) بھی عدیم النظیر خصوصیت کا حامل ہے، بلکہ ایک خاص نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو اِس دن کو، اُس دن پہ ایک گونہ فوقیت حاصل ہے۔ ۱۴ اگست کو ہمیں ایک ایسی جنگ میں کامیابی نصیب ہوئی جو بساطِ سیاست پر لڑی گئی اور اس کے نتیجے میں ہمیں ایک مملکت حاصل ہوئی۔ لیکن ستمبر (۱۹۶۵ء) میں ہم نے، اپنی جانیں دے کر اسے اس دشمن کے ہاتھوں میں جانے سے بچا لیا جو اسے چھیننے کے لئے، اپنی پوری قوت کے ساتھ میدانِ کارزار میں اتر آیا تھا۔ ہمارے قابلِ صد فخر شہداء اور مجاہدین نے، اس جنگ میں جو کارہائے درخشندہ سرانجام دیئے دنیا کی عسکری تاریخ میں ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ہمیں افسوس ہے کہ جس طرح یہ احسان فراموش قوم ۱۴ اگست کی اہمیت کو بھلائے جا رہی ہے، اسی طرح یہ ۶ ستمبر کی عظمت کو بھی فراموش کئے جا رہی ہے، اور نہیں سوچتی کہ احسان فراموش، ناشکرگذار قوم کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ طلوعِ اسلام بہرحال اپنی بساط کے مطابق، یادوں کے اُن چراغوں کو روشن رکھے جا رہا ہے جن کا روغن، مفکرِ قرآن پرویز صاحب کے خونِ جگر کا رہینِ منت ہے۔ انہوں نے ۵ ستمبر ۱۹۷۱ء کی صبح، ایک اجتماعِ عام سے خطاب کیا تھا، جس کا عنوان تھا ——— کیا یہ واقعی شہید ہیں؟ اس خطاب کی اہمیت کے پیشِ نظر، ہم اسے ملخصاً ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔]

خطاب

صدرِ محترم، برادرانِ گرامی قدر، اور میری عزیز بیٹیو اور بہنو! ——— سلام و رحمت

آج ہم جس عظیم واقعہ کی یاد منانے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ پاکستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل

ہے۔ قانونی طور پر مملکتِ پاکستان کا وجود ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو عمل میں آگیا تھا، لیکن اُسی دن سے ہندو اور انگریز نے یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ اس مملکت کو باقی نہیں رہنے دیں گے، اور، جیسا کہ میں آگے چل کر بیان کروں گا، انہوں نے اپنے اس مذموم ارادے کو چھپا کر نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی اس کا بھی بلند آہنگی سے اظہار کر دیا، اور ساری دنیا کو پکار کر سنا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ سترہ اٹھارہ برس تک اس سازش کو پختہ کرتے رہے، اور چھوٹی چھوٹی آزمائشی جھڑپوں کے بعد، انہوں نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح، بلا سابقہ الٹی میٹم، تاریکی کی چادریں لپیٹ کر یورش کرنے والے ڈاکوؤں کی طرح پاکستان پر حملہ بول دیا۔ ہمارے قابلِ صد فخر جیوشِ قاہرہ نے جس عدیم النظیر پامردی سے ان کا مقابلہ کیا، اور جس فقید المثال جرأت و بسالت سے انہیں پسپا کیا، اس کے تصوّر سے ساری دنیا آج تک محوِ حیرت ہے۔ اور باور ہی نہیں کرتی کہ ایسا بھی ممکن تھا۔ پاکستان کی

پاکستان کا یومِ تاسیس

بنیاد درحقیقت جنگِ ستمبر کے اُن سترہ دنوں میں رکھی گئی اور اس مملکت کا یہی یومِ تاسیس ہے جس کی یادگار منانے کی سعادت ہم آج حاصل کر رہے ہیں۔ اس جنگ میں جان دینے والے سرفروشوں کو ہم شہید کہتے ہیں۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے ـــــ اور یہ سوال عام طور پر ہماری نئی نسل کے ترجمانوں کی طرف سے ہوتا ہے ـــــ کہ کیا ہم ان جانثاروں کو محض رسماً شہید کہہ دیتے ہیں، یا وہ فی الحقیقت ایسے تھے (اور ایسے ہیں) چونکہ یہ سوال کچھ زیادہ عام ہوتا جا رہا ہے، اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کی وضاحت کر دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے آج کے خطاب کا خصوصی موضوع ہی یہی رکھا ہے۔ میں سب سے پہلے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جنگ میں اس طرح جان دے دینے والوں کے لئے قرآن مجید میں شہید کا لفظ نہیں آیا۔ اس میں انہیں مقتولین فی سبیل اللہ ـــــ اللہ کی راہ میں قتل ہو جانے والے ـــــ ہی کہا گیا ہے لیکن چونکہ مومن، جان دے کر اپنے دعوائے ایمان کی صداقت کی عملی گواہی پیش کرتا ہے، اس لئے اسے عرفِ عام میں شہید کہا جاتا ہے۔ شہید کے معنی گواہ یا نگران کے ہوتے ہیں۔ اور شہادت گواہی کو کہتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ سوال بالعموم ہماری نئی پود کے نوجوانوں کی طرف سے پوچھا جاتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ جنگ دو ملکوں، دو قوموں یا دو مملکتوں کے درمیان تھی۔ ہمارے جیالے جوانوں نے اپنی جان دے کر اس مملکت کو بچا لیا۔ ان کا یہ کارنامہ بے شک و شبہ صد تحسین و آفریں ہے لیکن ایسا تو ہر ملک کی محبِ وطن فوج کرتی ہے۔ پھر وہ فرق کیا ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے ہاں کے ان جاں سپاروں کو شہید کہتے ہیں، اور دوسری قوموں کے اسی قسم کے جانفروشوں کو ایسا نہیں کہتے۔

ان نوجوانوں کے دل میں اگر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں تو اس کے ذمہ دار وہ نہیں، ہم ہیں، جنہوں نے انہیں تاثر ہی ایسا دیا ہے۔ آپ جنگِ ستمبر ۶۵ء کے سترہ دنوں پر، اور اس کے بعد اس چھ سال کے عرصہ پر غور فرمائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم نے اس جنگ کو محض وطن کی جنگ کہہ کر پکارا ہے۔ آپ ان ترانوں کو سامنے لائیے جو ان جیالوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے گائے گئے، یا ان قصیدوں کو دیکھئے جو ان کے اعزاز میں پڑھے، یا

لکھے گئے۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ ان جانفروشوں سے کہا گیا تو یہ کہ :-

اے جانِ وطن، سلطانِ وطن — دم سے تیرے قائم شانِ وطن

یا
وطن کے تم ہو پاسباں! — تمہاری ہمتیں جواں!

یا یہ کہ
تم حریت کے باغ کی رنگیں بہار ہو — تم قوم کا غرور، وطن کا وقار ہو

انہیں پیغام دیا گیا تو یہ کہ :-

تم اپنے وطن کی حفاظت کو جاؤ —— وطن کو بچاؤ

اس کے جواب میں ان کی زبان سے کہلوایا گیا کہ :-

ہم ہیں وطن کے نوجواں — ہم ہیں وطن کے پاسباں
ہم ہیں وطن کی آبرو — ہم ہیں وطن کی عزو شاں

ان کے لئے دعائیں مانگی گئیں تو اس قسم کے الفاظ میں کہ :-

اے میرے وطن کے پاسباں —— زندہ باد

اور وہ کونسا کان ہے جس میں اس ترانے کی صدائے بازگشت نہیں گونجتی کہ :-

اے وطن کے سجیلے جوانو! — میرے نغمے تمہارے لئے ہیں

اور اس کورس کی ولولہ انگیز آواز کہ :-

وطن ہے ہمارا، وطن کے ہیں ہم — یہی دھن ہے جب تک رہے دم میں دم

یا
اے وطن، میرے وطن، پیارے وطن — کس قدر شاداب ہیں تیرے چمن

اور آخر میں پورے زور سے یہ دھمال کہ :-

"اے مادرِ وطن، اونچا ہو تیرا نام"

آپ دیکھیں گے کہ ان میں وطن سے آگے کچھ اور کہا ہی نہیں گیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وطن کی حفاظت کے لئے ہر قوم لڑتی ہے۔ چنانچہ جنگ کے دوران جہاں ہمارے ریڈیو سے وطن کے ان سرفروشوں کے حق میں ترانے گائے جاتے تھے، بعینہٖ انہی الفاظ میں، "آکاش وانی" (انڈیا) ریڈیو سے، ہندوستانی سپاہیوں کے حق میں قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ جب یہاں میجر عزیز بھٹی کو شہیدِ وطن کہہ کر، ملک کے بلند ترین اعزاز سے نوازا گیا تو انہوں نے بھی اپنے ہاں کے ایک (فرضی یا حقیقی) فوجی، عبدالحمید نائیک کو، انہی الفاظ سے پکارا۔ اندریں حالات اگر ہمارے نوجوان طبقہ کے دل میں اس قسم کے سوالات ابھریں کہ اگر وطن کی حفاظت میں جان دے دینا، شہادت ہے تو اسے پاکستان تک کیوں محدود رکھا جاتا ہے، دنیا کی ہر قوم کے سپاہی جو اپنے اپنے وطن کی حفاظت میں جان دے دیں، اسی اعزاز کے مستحق کیوں نہیں قرار دیئے جاتے، تو وہ ایسا پوچھنے میں، حق بجانب ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر پاکستان بھی دنیا کی دیگر مملکتوں جیسی ایک مملکت ہوتی تو اس کی حفاظت کیلئے لڑنے اور جان دینے والوں، اور دیگر مملکتوں کے اسی قسم کے سرفروشوں میں کچھ فرق نہ ہوتا۔ یہ بھی انہی کی طرح

محبوب وطن، حجاز کہلاتے۔ اور بس۔ لیکن مملکتِ پاکستان، دنیا کی دیگر مملکتوں جیسی مملکت نہیں۔ اس کی

مملکتِ پاکستان کی انفرادیت

حیثیت یکسر منفرد (UNIQUE) ہے اور اس کی یہی انفرادیت ہے جو کاروبارِ مملکت کے ہر گوشے میں اسے دوسری مملکتوں سے متمیز کر دیتی ہے۔ ہماری انتہائی بدقسمتی اور ہماری نئی نسل کی حرماں نصیبی ہے کہ ہم نے اپنے غلط نظامِ تعلیم کی وجہ سے، انہیں بتایا ہی نہیں کہ یہ مملکت، دنیا کی دیگر مملکتوں سے، کس اعتبار سے منفرد ہے اور اس کی وہ امتیازی خصوصیت کیا ہے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ یہ ہے ہماری وہ مجرمانہ فروگذاشت جس کی وجہ سے ہماری نئی نسل کے دل میں اس قسم کے سوالات ابھرتے ہیں اور جن کا اطمینان بخش جواب نہ ملنے کی وجہ سے، وہ عجیب قسم کی پریشانیٔ فکر و نظر کا شکار، اور اضطراب انگیز ذہنی اور قلبی کشمکش میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

اس فرق کو سمجھنے کے لئے درحقیقت، اسلام اور دیگر مذاہب کے بنیادی فرق کا سمجھنا ضروری ہے۔ مذہب خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جس کا اظہار پوجا پاٹ یا دیگر رسوم و شعائر کی شکل

دین اور مذہب کا فرق

میں ہوتا ہے۔ ایسے امورِ مملکت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ مملکت اپنا کاروبار سیکولر انداز سے سرانجام دیتی رہتی ہے اور مذہب پرستوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے طریق پر، ایشور کی پوجا پاٹ یا خدا کی بندگی اور پرستش کرتے رہیں، لیکن اسلام مذہب نہیں دین ہے، اور دین کے معنی ہوتے ہیں وہ نظامِ خداوندی جس کے مطابق امورِ دنیا سرانجام دیئے جائیں۔ یہ وجہ ہے کہ مذہب تو ہر مملکت میں، اور ہر قسم کی حکومت کے تحت زندہ رہ سکتا ہے، لیکن اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اس صورت میں بن سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ احکامِ خداوندی کو قانونی حیثیت سے نافذ کر سکے۔ اسی لئے قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ، خدا کے عطا کردہ اصولِ حیات اور نظریۂ زندگی کی صداقت کو تسلیم کر کے، اس کے متعین فرمودہ پروگرام کے مطابق کام کریں گے، انہیں مملکت مل جائے گی جس کا مقصد یہ ہوگا کہ: وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (۲۴/۵۵) کہ وہ اس میں اپنے دین کو متمکن (ESTABLISH) کر سکیں۔ لہٰذا اسلامی مملکت، دنیا کی دیگر مملکتوں کی طرح ایک مملکت نہیں ہوتی۔ یہ ذریعہ ہوتی ہے دین کو متمکن کرنے کا۔ اور یہی اس کی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ دنیا کی دیگر مملکتوں سے منفرد اور متمیز ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کی تصریحات

ہمارے صدرِ اوّل کے بعد یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں اسے سب سے پہلے، علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء میں (الٰہ آباد کے مقام پر) قوم کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے کہا تھا۔

> ہندوستان، دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقے میں مرکوز کر دیا جائے۔ . . . حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطے کا نام نہیں بلکہ ایک نظامِ حکومت ہے۔

(اور یہ حکومت صرف اپنی آزاد مملکت ہی میں قائم ہو سکتی ہے) اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر لی جائے۔

اپنے اس بنیادی تصور کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے، اپنے "خطباتِ تشکیلِ جدید" میں کہا تھا:۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رو سے، اسلام کے مثالی تصورات کو زمان اور مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں تشکل کرنے کی آرزو کا نام ہے۔ (ص۱۴۷) اسلام، تخت و تاج سے وفاداری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ صرف خدا سے عہدِ استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ (ص۱۴۸)

یہ تھی مطالبۂ پاکستان کی پہلی اینٹ۔ اسی حقیقت کو قائداعظمؒ نے، ۱۹ اگست ۱۹۴۱ء کو، حیدرآباد (دکن) میں بیان کیا تھا۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا کے ایک وفد نے ان سے سوال کیا تھا کہ مذہب اور مذہبی حکومت (RELIGION AND RELIGIOUS STATE) کے لوازم کیا ہیں۔ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:۔

قائدِ اعظمؒ کی تشریح

جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ نہ میں کوئی مولوی ہوں نہ ملا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے، البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔

یہ تھا عزیزانِ من! مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ۔ آپ نے دیکھا کہ یہ جذبۂ محرکہ نہ (عام معانی میں) سیاسی تھا، نہ معاشی۔ نہ اس تقاضا کی بنیاد اس پر تھی کہ ہندو نے ہمیں بہت تنگ کر رکھا تھا اس لئے ہم علیحدگی چاہتے تھے۔ یہ ہمارا دینی تقاضا تھا۔ یہ اسلام کا مطالبہ تھا۔ اسلام کو صحیح معنوں میں اسلام بننے کیلئے الگ، آزاد مملکت کی ضرورت تھی۔ یہی نظریۂ پاکستان تھا۔ یہی اسلامک آئیڈیالوجی ہے اور یہی وہ نظریہ، یا آئیڈیالوجی ہے جس کی ہندو اس قدر شدت کے ساتھ مخالفت کرتا تھا۔ اس کی مخالفت کی بنیاد بھی یہ نہیں تھی کہ اس طرح ہندوستان کا ایک ٹکڑہ الگ ہو جائے۔ اُس کی مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ وہ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت بن جائے۔ وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اسلامی اصول، مملکت کے آئین اور قوانین کی حیثیت سے نافذ العمل ہوں۔ اور اس کی اس مخالفت کی وجہ قابلِ فہم تھی۔ ایک طرف وہ جانتا تھا کہ ہندو نظامِ معاشرہ کس قدر انسانیت سوز اور آدمیت کُش ہے۔ جس معاشرہ کی بنیاد جنم کے اعتبار سے

ہندو کی طرف سے مخالفت

طبقاتی تقسیم، اور جس مذہب کی اساس، لکشمی دیوی (دولت کے معبود) کی پرستش پر ہو، جس نظام میں، سب سے بڑے سرمایہ دار کو مہاجن، سب سے بڑا انسان، قرار دیا جائے، اس معاشرہ کے وجہ تذلیل انسانیت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے! ایک طرف وہ اپنے متعلق اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھا، اور دوسری طرف اس کی نگاہ تاریخ پر تھی جس میں وہ دیکھ رہا تھا کہ جب اسلام کو بہ حیثیت ایک نظامِ مملکت فروغ حاصل ہوا تھا تو اس نے دنیا کے ہر انسانیت سوز نظام کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ لہٰذا، وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح کا نظام، اس کے آغوش میں پرورش پاکر، پروان چڑھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں اس کی موت مضمر ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسلام کے عمل نظام کے معنی ہیں:-

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

وہ جانتا تھا کہ اس قسم کا انقلابی پروگرام اگر اس کی سرحد کے پار عملاً وجود میں آگیا تو ہندوستان، بالمنت شمشیر، اسلام کے آغوش میں چلا جائے گا۔ اس نے تاریخ کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا تھا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا اور اس کی پوری پوری کوشش تھی کہ:-

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

لہٰذا:-

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

یہ تھی ہندو کی طرف سے تشکیلِ مملکتِ پاکستان کی مخالفت کی اصل لم — وہی، چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری جو ازل سے تا امروز برابر چلی آ رہی ہے۔

عزیزانِ من! یہ حقیقت ہے کہ جب بھی کسی نظام کا تصادم، قرآنی نظام سے ہوگا، وہ نظام پاش پاش ہو جائے گا۔ خدا نے جو کہا تھا کہ الدین، یعنی اسلامی نظام، لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ (۶۱/۹) دنیا کے ہر نظام پر غالب آ جائے گا، تو وہ اسی حقیقت کا اظہار تھا۔ ہندو اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ چاہتا یہ تھا کہ اسلام، ایک مذہب کی حیثیت سے زندہ رہے۔ اس کے لئے وہ ہر طرح کی آزادی اور ضمانت دینے کے لئے تیار تھا۔ لیکن وہ اسے بہ حیثیت ایک نظام کے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، یہ محض ظنّ و قیاس نہیں۔ اس کی تائید میں تاریخی شہادات موجود ہیں۔ پاکستان کا ریزولیوشن مارچ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا، تو (مہاتما) گاندھی تڑپ اٹھے اور انہوں نے، اپریل ۱۹۴۰ء کے شروع میں کہا کہ:-

قرآنی نظام کا غالب آنا

گاندھی کا اضطراب

میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ، مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال، حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظِ اسلام

کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز ۷-۲۳-۴۲)

ان کا یہ بیان، ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے یہی اخبار، اپنے ایک اداریہ میں لکھ چکا تھا کہ:-

حکومتِ خداوندی کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور یہ مسلمانوں کا فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۴-۴-۴۷)

(مہاتما) گاندھی نے اپنا مذکورہ بالا بیان ۷ر اپریل سنہ ۱۹۴۷ء کو شائع کیا تھا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد انہوں نے لکھا کہ:-

میری روح اس تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت، مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کا مرادف ہے کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۴-۴-۴۷)

آپ کو معلوم ہے کہ "قرآن اور گیتا" کا خدا ایک ہے، کہنے سے گاندھی کا مطلب کیا تھا؟ ان کا یہ مطلب انہی کے الفاظ میں سنیئے۔ انہوں نے "واردھا کی تعلیمی اسکیم" کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ:-

یہ سخت خطرناک بات ہے کہ بچوں کو یہ پڑھایا جائے کہ ان کا مذہب باقیوں سے افضل ہے۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔

آپ نے خود فرمایا، عزیزانِ من! کہ ہندو کی طرف سے مخالفت کی بنا کیا تھی؛ وہ اسلام کے اس تصور کی مخالفت کرتا تھا جس کی رو سے وہ ایک آزاد مملکت میں زندہ نظام کی شکل میں سامنے آتا تھا۔ بہرحال، ہندو کی

مخالفت کی شدت

طرف سے اس تصور کی مخالفت ہوتی رہی، اور قائدِ اعظم اپنے اس دعویٰ اور مطالبہ کو برابر دہراتے چلے گئے — یعنی اس دعویٰ کو، کہ اسلام اسی صورت میں اسلام کہلا سکتا ہے جب اس کی تنفیذ کے لئے مسلمانوں کی الگ آزاد مملکت ہو۔ جس شدت سے وہ اس دعویٰ کو دہراتے تھے، اسی نسبت سے ہندو کی مخالفت تیز تر ہوتی چلی جاتی تھی۔ چنانچہ (مہاتما) گاندھی نے اب کھلے الفاظ میں کہنا شروع کر دیا کہ:-

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم! میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے۔ مثلاً صحت، رسل و رسائل، امور خارجہ وغیرہ۔ مذہب سے اسے کچھ واسطہ نہیں۔ (ہریجن ۲۲-۹-۴۶)

لیکن ایسا کہتے وقت، گاندھی بھول جاتا تھا کہ اس کا مدِمقابل کون ہے؟ اس کا مدِمقابل، محمد علی جناحؒ جیسا

دیدہ ور تھا۔ چنانچہ جب گاندھی جی نے اس قسم کے اپدیش دینے شروع کر دیئے، تو قائداعظمؒ نے اسے ایک خط میں لکھا کہ:۔

> آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کے تعین میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ آپ کے نزدیک وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو ہمیں کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرتا ہے ——— کیا وہ جذبہ، وہ مقصد، مذہبی ہے، یا معاشرتی یا سیاسی۔ تو آپ نے کہا تھا کہ خالص مذہبی۔
>
> (قائداعظمؒ کا خط بنام گاندھی۔ مورخہ یکم جنوری ۱۹۴۰ء)

لیکن ادھر اکیلا گاندھی نہیں تھا۔ اس کی پوری کی پوری فوج اس کے ساتھ تھی۔ گاندھی کے بعد جواہر لعل نہرو بولے کہ:۔

جواہر لعل نہرو

> جس چیز کو مذہب، یا منظم (ORGANISED RELIGION) کہا جاتا ہے اسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مخالفت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔
>
> (میری کہانی)

اس نے یہ کہا اور دوسری طرف سے اسی کے ہم مرتبہ ایک اور کانگرسی لیڈر، مسٹر دیتھائی ڈیسائی پکارا کہ:۔

> اب یہ ناممکن ہو گا کہ کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رہنے دیا جائے۔ (ہندوستان ٹائمز ۵ ستمبر ۳۸ء)

ہندو اس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ اگر یہ مخالفت تنہا اسی کی زبان سے ہوتی رہی تو مسلمان مشتعل ہو جائیں گے، اس لئے اس نے خود مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس مخالفت میں انہیں آگے آگے رکھا۔

مسلمان ہم نوا

میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا تھا کہ یہ کون کون لوگ تھے اور انہوں نے کس کس طریق سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی۔ اس وقت میں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ اس مخالفت میں ہندوؤں نے خود مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کو آگے بڑھایا اور جیسا کہ کرائے کے ہم نواؤں کا شعار ہوتا ہے انہوں نے اس راگ کو اور بھی زیادہ اونچے سُروں سے الاپا۔ انہیں نیشنلسٹ مسلمان کہا جاتا تھا۔ ان کی جماعتیں مختلف ناموں سے موسوم تھیں لیکن مقصد ان سب کا ایک تھا۔ یعنی ہندو کی ہم نوائی میں مطالبۂ پاکستان کی مخالفت۔

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ ہندوستان میں، لڑائی کس بات پر تھی، اور بنائے نزاع کیا ہے مسلمان کا مطالبہ کیا تھا اور ہندوؤں کی مخالفت کس بات پر تھی۔ مطالبہ یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی بنیاد اسلام پر ہو، اور ہندو یہ کہتا تھا کہ ہم اس قسم کی مملکت کسی حال میں بھی قائم نہیں ہونے دیں گے۔ یہ تھا ملخص اس ساری لڑائی کا ۱۹۴۷ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس،

منعقد ہوئی جس کے صدر، مسٹر منشی نے، اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ:۔

> مسلمان اپنے لئے ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ:۔

> ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو، وہ کبھی اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ مسلمان اس قسم کی حکومت قائم کر لیں۔

اس کے برعکس، خود ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، وہ بھی دیکھتے جائیے۔ ان کا فیصلہ یہ تھا کہ:۔

> ہندوستان کو نظریہ اور عمل دونوں لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیئے جس کا کلچر ہندو، جس کا مذہب ہندو ہو، اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔
> (ڈاکٹر رادھا مکرجی ــــ ہندو مہاسبھا کے نائب صدر اور بنگال میں کانگریس پارٹی کے لیڈر)

مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لیا گیا

کامل نو دس سال کی مسلسل جنگ کے بعد، ہندو کو بالآخر اس مملکت کے آئینی وجود کو تسلیم کرنا پڑا، اور اگست ۱۹۴۷ء میں، مسلمانوں کو ایک الگ خطۂ زمین مل گیا تاکہ وہ اس میں اپنے مخصوص اور منفرد نظریہ کے مطابق خود مختار مملکت قائم کر لیں۔ ہندو کو یہ فیصلہ طوعاً و کرہاً تسلیم کرنا پڑا لیکن اس سے اس کے دل میں کرب و اضطراب کا جو طوفان اُبھرا اسے وہ ہزار کوششوں کے باوجود چھپا نہ سکا۔ تقسیم ہند کے اس اصولی فیصلہ سے تین ارکان متعلق تھے۔ ہندو، (جس کی نمائندہ کانگریس تھی)، مسلمان (جن کی نمائندہ مسلم لیگ، یا بالفاظِ صحیح قائد اعظمؒ تھے۔) اور انگریز۔ اس تقسیم کا اصولی اعلان ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ اور ۱۴ رجون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حسبِ ذیل ریزولیشن پاس کیا۔

ہندو کا اضطراب

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آ جائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

کانگریس کی طرف سے اس معاہدہ پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس وثیقہ پر دستخط ثبت کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف یہ اعلان بھی کر رہے تھے کہ:۔

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں۔ اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنے ٹیک کر ہم سے درخواست

کوشش کہ انہیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

پاکستان دشمنی کے بھرے ہوئے جذبات کے اظہار میں ہندوستان کی کوئی پارٹی بھی ایک دوسرے سے پیچھے نہیں تھی۔ مذکورہ بالا اعلانات کانگریس کی طرف سے ہو رہے تھے۔ دوسری طرف، ہندو مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی یہ کہہ رہے تھے کہ:۔

> ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا، خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، اور خواہ اس کے لئے کوئی اور طریقے استعمال کرنے پڑیں۔
> (آرگنائزر ۲ ـــ ۴۷ء)

اور تو اور، سوشلسٹ پارٹی کے ممتاز، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، تک، اعلان کر رہے تھے کہ:۔

> ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ ہی میں بھارت اور پاکستان کی درمیانی حدِ فاصل مٹ جائے گی۔ ہمیں پاکستان کے اس زہر کو ختم کر کے تقسیم ہند کو کالعدم قرار دے دینا چاہیئے۔ (ان کی کتاب "اگلا قدم")

اس سمجھوتے کا تیسرا فریق انگریز تھا، جس کے رویہ کے متعلق میں نے ابھی کچھ نہیں بتایا۔ ہمارے نوجوانوں کے دل میں یہ کہہ کر بھی زہر بھرا جاتا ہے کہ تقسیم ہند کی اسکیم درحقیقت انگریز کے دماغ کی اختراع تھی جس

انگریز کی طرف سے مخالفت

سے مقصد ہندوستان کو کمزور کرنا تھا۔ مسلم لیگ اس کی اس اسکیم کو بروئے کار لانے کا آلۂ کار تھی۔ محمد علی جناحؒ کس طرح ساری عمر انگریز کے خلاف کھلی لڑائی لڑتے رہے، یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ اسے میں کسی دوسری تقریب پر اٹھا رکھتا ہوں۔ اس وقت میں صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں انگریز، ہندو سے کم نہیں تھا۔ اور قائد اعظمؒ، جہاں ہندو کو بار بار متنبہ کرتے تھے کہ وہ اس مخالفت سے باز آ جائے۔ وہ انگریز سے بھی برملا کہتے تھے کہ ہم اس کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان حاصل کر کے رہیں گے۔ انہوں نے سندھ مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس میں اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کہا تھا کہ:۔

> برطانیہ، ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ سے وہی بازی لے جا سکتا ہے جس میں قوت ہو، لیکن ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے لڑیں گے۔

انہوں نے مارچ ۱۹۴۳ء میں، مرکزی اسمبلی کے بھرے اجلاس میں، پوری جرأت اور بیباکی سے کہا کہ:۔

> میں انگریز اور ہندو دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں مل کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے۔ زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو، ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو لیکن ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائیں۔

حتیٰ کہ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں پشاور کے ایک جلسۂ عام میں اعلان کر دیا تھا کہ:۔

ہمارا کوئی دوست نہیں۔ نہ ہمیں انگریز پر بھروسہ ہے، نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے خواہ وہ آپس میں متحد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔

اور انگریز کی اسی آتشِ مخاصمت کا نتیجہ تھا کہ جب اسے مجبوراً تقسیمِ ہند کے معاہدہ پر دستخط کرنے پڑے تو اس زمانے کے وزیرِ اعظم لارڈ اٹیلی نے (جو اس وقت میجر اٹیلی تھے) اس بل کو پارلیمان میں پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ:۔

ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔
(پاکستان ٹائمز ۶۵-۱۲-۱۵)

اس طرح پاکستان کی مملکت وجود میں آئی تھی۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد

۱۴/۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو، ہندوؤں کو بھی ایک آزاد مملکت مل گئی اور مسلمانوں کو بھی اور مسلمانوں کو بھی۔ چونکہ ہندوؤں کے نزدیک مملکت، مقصود بالذات تھی، اس لئے ان کی تگ و تاز کا سفر ختم ہو گیا۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک، مملکت، مقصود بالذات نہیں تھی بلکہ ایک ارفع و اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی اسی لئے وہ اپنے سفر میں ہنوز آخری منزل تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ اپنی جد و جہد کی ایک نئی وادی میں داخل ہوئے تھے۔ یوں سمجھئے جیسے ہم ایک مسجد کی تعمیر کے لئے قطعۂ اراضی حاصل کرنے کے لئے تگ و تاز کریں۔ برسہا برس کی سعی و کاوش کے بعد وہ قطعہ ہمیں حاصل ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس قطعۂ اراضی کا حصول ہماری جد و جہد کی آخری منزل نہیں ہو گا۔ اس کے بعد تعمیرِ مسجد کا مرحلہ ہمارے سامنے آئے گا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی وضاحت، قائدِ اعظمؒ نے، تشکیلِ پاکستان کے، دو ہی ماہ بعد (اکتوبر ۱۹۴۷ء میں) خالق دینا ہال کراچی میں، افسرانِ حکومت سے اپنے اولین خطاب میں ان الفاظ میں کی:۔

پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور اپنی ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں، اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رو بہ عمل لا سکیں۔

یہاں دین اور مذہب کا فرق پھر نمایاں طور پر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے ہم ہندوستان میں تھے تو ہمیں پوری پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس

دین اور مذہب کا عملی فرق

آزادی کا اعلان تو ملکہ وکٹوریہ نے اپنے منشور میں کر دیا تھا ہندو بھی اس کا وعدہ کرتا تھا کہ آزادی ملنے کے بعد مسلمانوں کو بدستور مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ نیشنلسٹ علماء جو تحریک پاکستان کی مخالفت میں ہندو کے ہمنوا تھے، اپنے مسلک کے جواز میں دلیل ہی یہ پیش کرتے تھے کہ جب مسلمانوں کو، ہندوستان میں رہتے ہوئے، مذہبی آزادی حاصل رہے گی تو پھر الگ مملکت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ان کی یہی وہ دلیل تھی جسے ردّ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:-

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

جیساکہ میں پہلے بھی واضح کر چکا ہوں، ہندو کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ مسلمانوں کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی آزادی حاصل رہے۔ لیکن وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اسلام، ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے پھر سے زندہ ہو جائے۔ اس میں اسے اپنی موت دکھائی دیتی تھی۔ اور یہی وجہ اس کی انتہائی مخالفت کی تھی۔ اس درجہ تک مخالفت کی، کہ (مہاتما) گاندھی نے پاکستان بننے سے عین قبل پہلے کہا تھا کہ:-

اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے تو پھر بھی ہم مطالبۂ پاکستان منظور نہیں کریں گے۔ خواہ اسے بزورِ شمشیر ہی طلب کیوں نہ کریں۔

(دی ٹرانسفر آف پاور اِن انڈیا۔ مصنف ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لمبی)

حصول و تشکیلِ پاکستان کے اس پس منظر کے بعد، میں اپنی قوم کی نئی نسل سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا بات اب ان کی سمجھ میں آتی ہے یا نہیں کہ دنیا کی دیگر مملکتوں، اور مملکتِ پاکستان میں ایک بنیادی فرق تھا اور وہ فرق یہ تھا کہ مملکتِ پاکستان درحقیقت ایک خطۂ ارض تھا جسے اس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں قرآنی اقدار و اصولِ حیات کو ایک نظام کی شکل میں، عملاً نافذ کیا جائے اور اس طرح، دنیا کے سامنے اس حقیقت کو ایک بار پھر بے نقاب کیا جائے کہ یہ نظام کس طرح نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت اور وجۂ بالیدگی شرفِ انسانیت ہے۔ اس نظام کے متشکل ہو جانے کے بعد یہ مملکت اسلامی بن جائے گی۔

اب یہاں سے یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ:-

اس خطۂ زمین کی حفاظت

(۱) ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لئے تگ و تاز، جسے آخرالامر اسلامی مملکت بنانا مقصود ہو، جہادِ فی سبیل اللہ کہلائے گا یا نہیں؟ اور

(۲) جب یہ خطۂ زمین حاصل ہو جائے تو اس کی حفاظت مسلمانوں کے لئے عین دینی فریضہ قرار پا جائیگا یا نہیں۔ اور اگر دشمن اس پر حملہ کرے، تو اس کی مدافعت کے لئے جنگ، قتال فی سبیل اللہ سمجھی جائے گی یا نہیں۔ اور اس معرکہ میں جواب دینے والے، مقتولین فی سبیل اللہ، یعنی شہید، کہلائیں گے یا نہیں؟ واضح رہے کہ "فی سبیل اللہ" سے مراد ہوتی ہے ان مقاصد کی خاطر جنہیں خدا نے متعین کیا ہے۔ جیساکہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، دین کے تمکن کے لئے استخلاف الارض یعنی اسلامی مملکت کا قیام، خدا کا متعین فرمودہ

مقصد ہے اور مقصد بھی اولین۔ اس لئے اس کے فی سبیل اللہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

اب رہا اس مملکت کا تحفظ، سو قرآن کریم نے اس کی سرحدوں کی حفاظت (TERRITORIAL INTEGRITY) کی تاکید یہ کہہ کر کر دی کہ: اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ۔ (۸/۶۰) جس قدر قوت اور سامانِ حرب و ضرب تمہارے امکان میں ہو، اس سے اپنی مملکت کی سرحدوں کو مضبوط کرو تاکہ اس سے تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمنوں کے دل میں تمہارا خوف طاری رہے اور وہ آگے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ ان میں سے کچھ دشمن تو تمہارے سامنے ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو ہنوز تمہارے سامنے نہیں آئے اس لئے ان کا تمہیں علم نہیں۔ خدا کو ان کے متعلق سب معلوم ہے۔ لہٰذا، تم معلوم اور نامعلوم، ہر قسم کے دشمن کی مدافعت کے لئے اپنی سرحدوں کو خوب مضبوط رکھو ——— یہ مجاہدینِ فی سبیل اللہ کا اولین فریضہ ہے۔ اور اگر دشمن آگے بڑھنے کی جرأت کرے تو پھر اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ۔ (۲/۱۹۰) جو تمہارے خلاف آمادۂ جنگ ہوں ان سے جنگ کرو۔ تمہاری یہ جنگ "فی سبیل اللہ" ہوگی۔

اس مقام پر کہا جائے گا کہ یہ سب کچھ اسلامی مملکت کی حفاظت کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ اور پاکستان تو ہنوز اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے اس مملکت کی حفاظت کے لئے جنگ، قتال فی سبیل اللہ، اور اس جنگ میں کام آجانے والوں کو شہید کس طرح کہا جا سکے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان ابھی تک اسلامی

پاکستان اسلامی مملکت نہیں

مملکت نہیں بن سکا لیکن سوال اُس خطۂ زمین کی حفاظت کا ہے جسے اسلامی مملکت بنانے کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ مملکت ابھی تک اسلامی نہیں بن سکی لیکن یہ آج تک کسی نے نہیں کہا کہ اسے اسلامی مملکت نہیں بنایا جائے گا۔ اس کے برعکس، یہاں ہر حکومت اور ہر آئین ساز ادارہ نے اس اقرار کو دہرایا اور اس کی توثیق کی ہے کہ پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس لئے اسے اسلامی مملکت بنایا جائے گا۔ جب تک اس مملکت کے باشندوں کا یہ عزم و اقرار ہے، اس وقت تک اس خطۂ زمین کی حفاظت کے لئے ہر کوشش، جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس مقصد کے لئے جان دے دینا شہادت۔ اس کی نظیر خود تاریخ اسلام کا اولین باب ہے۔ حضورؐ نبی اکرم نے اپنی مکی زندگی کی تیرہ سالہ جدوجہد سے ایک جماعت تیار کی جس کا مقصد، اسلامی مملکت کی تشکیل تھا، چونکہ اس مقصد کے لئے، مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا زیادہ سازگار تھی، اس لئے آپ نے اُس طرف ہجرت فرمائی۔ اس ہجرت سے اسلامی مملکت کا قیام فوری طور پر عمل میں نہیں آ گیا تھا۔ اس سے صرف اس کے امکانات روشن ہوئے تھے۔ قریش کے نزدیک اگر مسئلہ محض قومی یا وطنی ہوتا تو جب ان لوگوں (مسلمانوں) نے اس وطن کو چھوڑ دیا تھا، تو قریش کی مخالفت ختم ہو جانی چاہیئے تھی۔ لیکن ان کی مخالفت اس نظام کے خلاف تھی جسے مسلمان قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ مخالفت اس لئے تھی کہ انہیں اس نظام میں اپنی موت نظر

آئی تھی۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کا پیچھا نہ چھوڑا، اور مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے اُمنڈ آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ حملہ کسی اسلامی مملکت کے خلاف نہیں تھا ـــــ اسلامی مملکت تو اس وقت وجود ہی میں نہیں آئی تھی ـــــ یہ حملہ، اسلامی مملکت کے وجود میں آنے کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے تھا۔ اس لئے اس حملہ کا مقابلہ قتال فی سبیل اللہ تھا۔ بلکہ یہی وہ قتال (جنگ) تھا جس سے جماعتِ مومنین کو جنگ کرنے کی اجازت یا حکم کی ابتداء ہوئی تھی۔ (۲۲/۳۹) یہ جنگِ بدر تھی اور ظاہر ہے کہ اس میں جان دینے والوں کے شہید ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟ انہوں نے تو اپنے مقدس خون کی روشنائی سے کتابِ شہادت کی پہلی سطر رقم فرمائی تھی ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل　　قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

جنگِ بدر اور جنگِ ستمبر

جہاں تک احوال و کوائف کا تعلق ہے، جنگِ بدر اور پاکستان کی جنگِ ستمبر (۱۹۶۵ء) میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، وہ جنگ اسلامی مملکت کی حفاظت کے لئے نہیں لڑی گئی تھی۔ اس مملکت کے قیام کے امکانات کے تحفظ کے لئے لڑی گئی تھی۔ اس کی یہی وہ اہمیت تھی جس کے پیشِ نظر حضور نبی اکرم نے، عین میدانِ جنگ میں، جب اسلام کی کل کائنات، تین سو تیرہ سرفروش، اپنا سب کچھ تیاگ کر، اپنے سے تین گنا لشکرِ جرّار کے سامنے صف آراء ہو چکے تھے، اس وقت آپؐ نے بحضورِ رب العزت عرض کیا تھا کہ یا الٰہا! میں تیرے دین کے اس سارے سرمایۂ حیات کو لے کر، اس میدان میں اتر آیا ہوں۔ اگر یہ تین سو تیرہ نفوس، جو بظاہر بڑے ہی ضعیف و ناتواں اور بے ساز و سامان ہیں، یہاں ختم ہو گئے تو دنیا میں، قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔

سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی اس دعا میں جس حسین و جمیل طریق سے خود خدا نے کائنات کو ایک فریق، اور فریق بھی فریقِ اعلیٰ بنا لیا گیا ہے، وہ بڑا وجد آفریں اور روح پرور ہے۔ کہنے والا کہہ یہ رہا ہے کہ میں تو اپنی ساری کائنات تجھ پہ نچھاور کرنے کے لئے (لے کر) حاضر ہو گیا ہوں ـــــ چونکہ اس سے زیادہ نہ ہمارے پاس کچھ اور ہے نہ ہم کچھ اور کر سکتے ہیں ـــــ سپردم بتو مایۂ خویش را ـــــ اب، تو خود سوچ لے کہ اس پونجی سے تو نے کیا کام لینا ہے۔ اگر اسے یہیں ختم کر دینا ہے تو اس کے بعد تو جانے تیرا کام۔ ہم تو یہ سب کچھ لٹا کر چلے جائیں گے کہ ہم آئے ہی اس نیت سے ہیں، لیکن اس کا جو نتیجہ ہو گا، اسے تو خود دیکھ لے۔ یہ ہمارا کام نہیں، تیرا کام ہے۔ آپ نے غور فرمایا، برادرانِ عزیز! کہ اس معصوم اور حسین دعا میں، خدا پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد کر دی گئی ہے۔ یہ مقام ایسی ہی بلند ہستی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ حضورؐ کی یہی وہ دعا تھی جس سے، شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر، اقبالؒ نے اپنی وہ مشہور غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے کہ ؎

اگر کج رَو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

اور مقطع ہے کہ؎

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

ہاں! یہ تھی جنگِ بدر کی اہمیت۔ اور اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں، عزیزانِ من! بلا تمثیل، عرض

جنگِ ستمبر کی اہمیت

کرنے کی جرأت کروں گا کہ کم و بیش یہی اہمیت اصولی طور پر ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کی تھی۔ ہمارے مجاہدین جانفروش اپنی ساری متاعِ حیات لے کر، میدانِ کارزار میں، شمشیر بدست اور کفن بدوش آ نکلے تھے اور یہ کہہ کر آ نکلے تھے کہ؎

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

سوچئے برادرانِ عزیز! اگر اس جنگ میں انہیں شکست ہو جاتی پھر دنیا میں اسلامی مملکت کے قیام کے امکانات کے چراغ گل ہو جانے یا نہیں؟ انہوں نے اس خطۂ زمین کی حفاظت کے لئے جان دے دی جسے اعلائے کلمۃ الحق کا ذریعہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ اس لئے ان کی موت، شہید کی موت ہے جس پر خدا اور اس کے فرشتے تحسین و تبریک کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَرَحۡمَۃٌ وَّاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُھۡتَدُوۡنَ۔ (۲/۱۵۷) اس میں شبہ نہیں کہ جنگ بدر و اُحد میں شریک ہونے والے صحابہ کبارؓ تھے، جن کے (صحابیؓ ہونے کی جہت سے) علوِ مرتبت تک، کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جہاں تک خدا کی راہ میں جان دے کر، حیاتِ جاوداں حاصل کر لینے کا تعلق ہے، مبداءِ فیض کی اس نوازشِ بے پایاں کے دروازے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ یہ واقعہ بھی تو جنگِ اُحد ہی کا ہے کہ عمروؓ بن ثابتؓ جو اصیرم کے نام سے مشہور تھے، غزوۂ اُحد کے دن اسلام لائے۔ تلوار ہاتھ میں لی اور سیدھے میدان میں جا پہنچے۔ جانفروشانہ لڑے اور تبسم فشاں جان دے دی۔ حضورؐ نے ان کی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا کہ اصیرم کس قدر خوش نصیب ہے کہ اس نے ایک وقت کی بھی نماز نہ پڑھی لیکن سیدھا جنت میں پہنچ گیا؎

عشق کی ایک جست نے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

دوسری طرف یہ واقعہ بھی اسی جنگ کا ہے کہ مدینہ میں ایک شخص تھا، قزمانؔ نامی۔ اس کی مذموم حرکات اس قدر واضح تھیں کہ حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شخص جہنمی ہے۔ غزوۂ احد کے دن یہ قریش کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑا، اور دشمن کے سات آٹھ افراد کو قتل کیا۔ صحابہؓ اس کی بہادری پر خوش تھے۔ وہ زخمی ہوا تو وہ اس کے پاس گئے اور کہا کہ قزمانؔ! ہم تم کو یہ خوشخبری دیتے ہیں کہ تم نے بہت بڑا کام کیا۔ اس نے کہا کہ خوشخبری کا ہے کی۔ یہ تو مکہ اور مدینہ والوں کی قومی جنگ تھی۔ مجھے قومی حمیت نے ابھارا، اس لئے میں میدان میں آ گیا۔ یہ نہ ہوتا تو یہاں کبھی نہ آتا۔ اس سے صحابہؓ کی سمجھ میں یہ بات

آئی کہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے کفار کے مقابلہ میں لڑتے ہوئے جان دینے والا بہرحال مغفرت و رحمت کا سزاوار نہیں ہو جاتا۔ شہادت اسی کی ہے جو فی سبیل اللہ جان دے۔ اس سے دین اور وطن کا بنیادی فرق سامنے آ جاتا ہے۔

یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے تحریکِ پاکستان کو "معرکۂ دین و وطن" کہہ کر پکارا تھا اور اسی حقیقت کو قائدِ اعظمؒ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ :-

"پاکستان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف آزادی حاصل ہی نہیں کرنی ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں۔ اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔" (فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام پیغام۔ جون ۱۹۴۵ء)

اور یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے جان دینا شہادت ہے۔ لہٰذا جب تک اس خطۂ زمین کے رہنے والوں کا یہ فیصلہ برقرار ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا، اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش جہاد ہے اور اس مقصد کے لئے جان دے دینا عین شہادت۔ اور فاتح و منصور واپس لوٹنا، باعثِ اجرِ عظیم۔ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ۔ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (۴/۷۴) جو بھی فی سبیل اللہ لڑنے کے لئے میدانِ جنگ میں جائے۔ پھر وہاں جان دے دے یا غالب و فاتح حیثیت سے واپس لوٹے، ان سب کے لئے اجرِ عظیم ہے۔

لہٰذا جب تک یہ خطۂ زمین، نظامِ خداوندی کے قیام کا ذریعہ قرار پاتا ہے، اس کی حفاظت کی ہر کوشش جہاد ہے۔ ہاں اگر بدقسمتی سے، قوم اپنے اس دعوے سے پھر گئی تو پھر یہ مملکت بھی دنیا کی دوسری مملکتوں کی طرح قومی مملکت بن کر رہ جائے گی اور اس کی حفاظت ایک قومی فریضہ قرار پائے گی۔ دینی فریضہ نہیں۔ لیکن جن مجاہدین و مقتولین فی سبیل اللہ کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں، ان کے غازی اور شہید ہونے میں کیا کلام ہے۔ درخورِ صد رشک ہے ان کی زندگی اور موجبِ صد ہزار افتخار ہے ان کی موت۔ وہ موت جس پر کروڑوں زندگیاں نچھاور کی جا سکتی ہیں۔ راجستھان، کھیم کرن، بیدیاں، برکی، واہگہ، پسرور، چونڈہ اور سیالکوٹ کی زیارت گاہیں ان شہداء کے مقدس خون سے ایسے لالہ زاروں میں تبدیل ہو چکی ہیں جن پر کبھی خزاں نہیں آ سکتی۔ یہ انہی لالہ زاروں کا صدقہ ہے جو ہم آج دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہیں۔

اے، اپنی جان کی قیمت دے کر ہمارے لئے زندگی خریدنے والو! ملتِ پاکستانیہ اپنی جھکی ہوئی نگاہوں سے تمہاری بارگاہ میں ہزاروں سلام اور لاکھوں احترام پیش کرتی ہے۔ ہمارے اس نذرانۂ عقیدت و خراجِ محبت کو قبول فرمائیے۔

میراث سے متعلق ایک سوال

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کے ترجمان ـــــ ماہنامہ فکر و نظر ـــــ کی جون ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں، عنوانِ بالا کے تحت ایک مختصر سا شذرہ شائع ہوا ہے، جسے پڑھ کر ہمیں بڑا دکھ ہوا۔ اسی کا احساس ان سطور کے لکھنے کا محرک ہے۔ آپ پہلے اس شذرہ کو ملاحظہ فرمالیں۔

چند ماہ قبل ہی ہمیں "پوتے کی میراث" کے بارے میں ایک مکتوب گرامی ملا۔ جس پر ایک عالم کا تبصرہ پیش خدمت ہے۔

"معزز مراسلہ نگار نے عائلی قوانین کی اس شق پر بحث کی ہے جس کی رو سے باپ کی وفات کی صورت میں یتیم پوتوں کو دادا کی میراث میں سے باپ کو زندہ فرض مان کر حصہ دیا جاتا ہے۔ اس کی تائید ائمہ اربعہ میں سے کسی مسلک سے نہیں ہوئی۔ یہ میراث کے احکام اور اصول کے منافی ہے۔ علماء نے پہلے ہی اس پر تفصیل سے لکھا ہوا ہے، مراسلہ نگار نے یہ رائے دی ہے کہ یتیم پوتوں کو بجائے دادا کی میراث میں سے حصہ دلانے کے وصیت کے ذریعہ فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے اپنی زندگی میں یا تو دادا خود پوتوں کے حق میں وصیت کر جائے ورنہ پھر وصیت کو فرض مان کر ان کو یہ حصہ دیا جا سکتا ہے۔ مراسلہ نگار کے خیال میں وصیت کرنا فرض ہے۔

جہاں تک فرضیت وصیت کا تعلق ہے یہ بات واضح ہے کہ وصیت جمہور فقہاء کے نزدیک اختیاری ہے نہ کہ واجب، اس لئے یتیم پوتوں اور میراث میں سے حصہ پانے والے قریبی رشتہ داروں کے لئے مرنے والے پر وصیت لازم نہیں ہے۔ (ردالمحتار۔ ج ۵۔ ص ۴۵۸)۔ البتہ بعض علماء نے ان قریبی رشتہ داروں کیلئے جن کو میراث میں سے حصہ نہیں ملتا جیسے یتیم پوتے وغیرہ وصیت واجب قرار دی ہے۔ اگر مرنے والا وصیت نہ کرے، اور بغیر وصیت کے مر جائے تو ان کے نزدیک یتیم پوتوں کے حق میں خود بخود وصیت نافذ تصوّر ہو گی۔ اور اس صورت میں یتیم پوتوں کو دادا کی میراث میں سے حصہ مل جائے گا بشرطیکہ وہ میراث کی ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو، ورنہ ایک تہائی ہی ملے گا۔ اس قول کی نسبت اسحٰق الوسلیمان، سعید بن المسیب حسن بصری، اور احمد بن حنبل کی طرف کی جاتی ہے۔ ابن حزم کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔ (ملاحظہ ہو ابن حزم محلی۔ ج ۹۔ ص ۳۱۵۔ ۳۱۴) نیز دیکھئے عمر بن عبداللہ، احکام المواریث ص ۳۲۳۔ اور عبدالرحیم الترکۃ

وما یتعلق بہا من الحقوق ۔ ص ۲۰۵)

یتیم پوتے کی میراث کا مسئلہ حل کرتے ہوئے حکومت مصر نے ۱۹۴۶ء میں مروجہ قانون وصیت میں ترمیم کرکے اس کو ملکی قانون کا حصہ بنادیا۔ اس کے رو سے ہر یتیم پوتے کو اپنے دادا یا دادی کی میراث میں سے حصہ مل جاتا ہے، خواہ اس کے دادا نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ (ملاحظہ ہو، عبد الرحیم الترکۃ وما یتعلق بہا من الحقوق ۔ ص ۲۰۵) معزز مراسلہ نگار کی اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ بجائے احکامِ میراث کو یکسر نظر انداز کرکے یتیم پوتوں کو باقاعدہ دادا کی میراث میں حصہ دار بنا دیا جائے، بہتر ہوگا کہ قانونِ وصیت پر عمل کیا جائے جس میں اس کی گنجائش موجود ہے۔

یتیم پوتے کی میراث کا مسئلہ اختلافی ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کی جا سکتی یہ مجتہدین کے اجتہاد اور ان کے دلائل پر موقوف ہے۔"

اس شذرہ میں حسبِ ذیل الفاظ پر آپ ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالئے۔

جہاں تک فرضیتِ وصیت کا تعلق ہے یہ بات واضح ہے کہ وصیت جمہور فقہا کے نزدیک اختیاری ہے نہ کہ واجب، اسی لئے یتیم پوتوں اور میراث میں حصہ پانے والے قریبی رشتہ داروں کے لئے مرنے والے پر وصیت لازم نہیں۔

"تبصرہ نگار عالم" نے علماء۔ فقہاء۔ مجتہدین ـــــ اسحٰق ابن سلیمان، سعید بن المسیب، حسن بصری، احمد بن حنبل، ابن حزم (علیہم الرحمۃ) کا نام بھی لیا ہے اور رد المختار۔ محلیٰ ـــــ احکام المعارف۔ الترکہ جیسی کتابوں کی سند بھی پیش کی ہے، یہ کہنے کے لئے کہ وصیت واجب نہیں۔ لیکن شریعتِ حقہ میں سند اور حجت کے سلسلہ میں ایک اللہ نام بھی ہے، جسے اللہ تعالےٰ کہتے ہیں، اور ایک اور کتاب بھی جس کا نام القرآن ہے۔ انہوں نے ان کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وصیت کی فرضیت کے متعلق یہ کتاب کیا کہتی ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۔ (۲/۱۸۰)

تم میں سے جب کوئی قریب المرگ ہو اور وہ کچھ مال اپنے ترکہ میں چھوڑ رہا ہو، تو اس پر فرض قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے والدین اور اقربا کے لئے معروف طریق سے وصیت کرے۔ ایسا کرنا متقین کے لئے واجب ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم میں شاید ہی کوئی اور حکم ایسا ہو جس کی فرضیت کو اس تاکید و توثیق کے ساتھ بیان

ط "ایک اللہ نام" کے الفاظ ہم نے تبصرہ نگار کے الفاظ کی نسبت سے لکھے ہیں، ورنہ دین میں سند اور حجت صرف یہی ایک نام (اللہ تعالےٰ) اور یہی کتاب (قرآن مجید) ہے۔

کیا گیا ہو۔ آیت کے شروع میں "کُتِبَ عَلَیْکُمْ" ہے اور آخر میں "حقاً علی المتقین"۔

آگے چلئے۔ قرآن مجید میں بہت کم احکام ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی اس نے خود متعین کر دی ہوں۔ لیکن وصیت ایک ایسا فریضہ ہے جس کے متعلق اس نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ اس کے لئے گواہ کس قسم کے ہوں، وہ گواہی کس طرح سے دیں، وغیرہ وغیرہ۔ ملاحظہ ہو سورۃ المائدہ (۵/۱۰۶-۱۰۸)

جیسا کہ سورۃ بقرہ کی مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے، وصیت ہر مومن پر فرض ہے۔ یہ وصیت اپنے مال کے متعلق کی جائے گی اور جس کے حق میں جی چاہے کی جائے گی، خواہ وہ میراث میں حصہ پانے والے ہوں یا نہ — والدین سے بڑھ کر میراث میں حصہ پانے والے اور کون ہو سکتے ہیں! سورۃ النساء میں قرآن مجید نے ترکہ میں ورثا کے حصے مقرر کئے ہیں لیکن ہر حصہ کے بعد کہا ہے کہ:۔

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ۔ (۴/۱۱-۱۲)

یعنی متوفی کے قرضہ کی ادائیگی اور اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد اگر کچھ بچے تو اس کی تقسیم ان حصوں کے مطابق ہوگی۔

"فکر و نظر" میں جس طرح وصیت کے متعلق ارشادِ خداوندی کے صریحاً خلاف لکھا گیا ہے اسی طرح یتیم پوتے کی وراثت کے متعلق بھی جو کچھ کہا گیا ہے وہ قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں احکامِ وراثت کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۔۔۔ (۴/۱۱)

"اللہ تعالیٰ تمہیں، تمہاری اولاد کے بارے میں کچھ احکام دیتا ہے۔"

اور اس کے بعد ترکہ میں (علاوہ دیگر ورثا) اولاد کے حصوں کا ذکر ہے۔ عربی زبان میں اولاد کا لفظ بیٹے بیٹی تک محدود نہیں۔ اس میں نیچے تک (پوتا، پڑپوتا وغیرہ) سب داخل ہوتے ہیں۔ دو ایک سندیں ملاحظہ فرمائیے۔ تفسیر خازن میں آیت "فَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ۔ (۴/۱۲)" کے ذیل میں لکھا ہے:۔

اسم الولد يطلق على الذكر والانثى - ولا فرق بين الولد وولد الابن وولد البنت في ذالك۔

ولد کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے بولا جاتا ہے اور اس میں بیٹے۔ اور بیٹے کی اولاد اور بیٹی کی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔

فتح الباری، شرح بخاری (مطبوعہ مصر۔ جلد ۱۲ ص) میں ہے۔

الولد اعم من الذكر والانثى ويطلق على الولد الصلب وعلى ولد الولد وان سفل۔

ولد کا لفظ مذکر اور مؤنث، دونوں کے لئے عام ہے۔ اور صلبی اولاد اور نیچے تک اولاد کی اولاد

تک کے لئے بولا جاتا ہے۔
حتیٰ کہ شریفیہ شرح سراجی میں بھی کہا گیا ہے کہ:۔
ولد الابن داخل فی الولد لقولہ تعالیٰ یا بنی آدم۔
اولاد میں بیٹے کی اولاد بھی شامل ہے کیونکہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کہا ہے۔
اس کے بعد یتیم پوتے کی وراثت کے سلسلہ میں ذیل کی مثال سامنے لائیے۔

رشید (سعید کا دادا)
|
حمید (رشید کا بیٹا)
|
سعید (رشید کا پوتا - یعنی حمید کا بیٹا)

رشید کا قریب ترین ولد حمید ہے اس لئے رشید کی وفات پر وہ اس کا وارث ہوگا۔ لیکن اگر رشید کی زندگی میں حمید وفات پا جائے تو سعید، رشید کا ولد ہو جائے گا اور وراثت میں حصہ پائے گا۔ اگر دادا وصیت کرنا چاہے تو یتیم پوتے کو جتنا چاہے دے دے۔ اگر وصیت نہیں کر سکا تو وہ دادا کے ترکہ میں بیٹے کی طرح حصہ پائے گا۔ قرآنِ کریم کی رو سے، یہ اس قدر واضح بات ہے کہ اس کے متعلق کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں۔

ہمیں امید ہے کہ مؤقر جریدہ، فکر و نظر، اور ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، وصیت اور وراثت کے متعلق مندرجہ بالا قرآنی احکام کی روشنی میں اپنے شذرہ پر نظرِ ثانی کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۷ء

طلوعِ اسلام ہر ماہ کی یکم تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے۔ حالیہ انتخابات میں حصہ لینے والی پارٹیوں نے کہا ہے کہ وہ اپنے انتخابی منشور وسط ستمبر کے بعد شائع کریں گے۔ ممکن ہے ہمیں ان منشوروں پر قرآنی فکر کی روشنی میں تبصرہ کی ضرورت پڑے۔ اگر ایسا ہوا تو طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شاید دو چار روز کی تاخیر ہو جائے۔ قارئین مطلع رہیں۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۷ء

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن کا انعقاد بالعموم، اکتوبر کے مہینے میں ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیکن امسال اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں ملک میں انتخابات کا ہنگامہ گرم ہوگا اس لئے سردست اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کنونشن کا انعقاد کب مناسب ہوگا۔ اس کا فیصلہ اکتوبر کے آخری ہفتہ میں کیا جا سکے گا۔

طلوعِ اسلام کنونشن کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ یہ سوچا جائے کہ قرآنی فکر کی۔ وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کے لئے کنونشن کے انعقاد کی تاریخوں کے متعلق کچھ زیادہ قبل اندفت نوٹس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ اس کے پروگرام کی ایک شق ایسی ہوتی ہے جس کے متعلق قبل از وقت اطلاع ضروری ہوتی ہے۔ اور وہ ہے وہ "مجلسِ مذاکرہ" جس میں بالعموم طلبا اور طالبات حصہ لیتے ہیں۔ ان کا تقاضا ہوتا ہے۔ (جو بالکل جائز تقاضا ہے) کہ انہیں مقالات کی تیاری کے لئے کافی وقت ملنا چاہیئے۔ ان کی اطلاع کے لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ آئندہ کنونشن میں مذاکرہ کا موضوع ہوگا:

ہم نے پاکستان کیوں حاصل کیا تھا؟

مذاکرہ میں حصہ لینے کے خواہاں طلبا وغیرہ، اپنے مقالات تیار رکھیں اور جب کنونشن کے انعقاد کی تاریخوں کا اعلان ہو، تو (حسبِ معمول) مسودات ادارہ میں بھیج دیں۔

تبویب القرآن

بفضلہ الحمد کہ تبویب القرآن کی تیسری جلد کی طباعت کا مرحلہ بھی قریب الاختتام ہے۔ چند ایک پلیٹوں کی چھپائی باقی ہے۔ اس کے بعد جلد سازی شروع ہو جائے گی۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے ——— تبویب القرآن ایک دائرۃ المعارف ہے جسے جلدوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محض بغرضِ سہولت ہے کہ اس کی قریب بیان بیان سو صفحات کی تین جلدوں میں تجلید کی جا رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ اشاعت تک ہم اس کی اشاعت کے متعلق حتمی اعلان کر سکیں گے ——

وبیدہ التوفیق۔

(ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام)

ادارۂ طلوعِ اسلام کی
مطبوعات کی قیمتیں

نوٹ :- ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن پارہ اوّل	۵/- روپے	مطالب الفرقان (جلد دوم)	۵۰/- روپے
" " پارہ نمبر ۲ تا ۲۶	۳/- "	اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ ایڈیشن مجلد)	۱۵/- "
پارہ نمبر ۲۷	(فی پارہ)	من و یزداں	۲۵/- "
" " پارہ نمبر ۲۸ و ۲۹	۷/- روپے	ابلیس و آدم	۲۵/- "
" " پارہ نمبر ۳۰	۵/- "	جوئے نور	۲۵/- "
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلد) (تین جلدوں میں)	۱۲۰/- "	برقِ طور	۲۵/- "
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ کھلے پارے)	۹۵/- "	شعلۂ مستور	۲۵/- "
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلد)	۱۰۰/- "	جہانِ فردا	۲۵/- "
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	۴۰/- "	کتاب التقدیر	۳۰/- "
		معراجِ انسانیت	۴۵/- "
		شاہکارِ رسالت	۴۵/- "
		اقبال اور قرآن	۲۵/- "
		انسان نے کیا سوچا؟	۲۰/- "

نام کتاب	قیمت
ISLAM A CHALLENGE (BOUND EDITION)	۴۰/- روپے
ISLAM A CHALLENGE (PAPER BACK EDITION)	" ۲۵/-
سلسبیل	" ۱۰/-
فردوسِ گم گشتہ	" ۱۰/-
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلد)	" ۱۵/-
سلیم کے نام خطوط (مکمل سیٹ)	" ۳۶/-
طاہرہ کے نام خطوط	" ۶/-
مقامِ حدیث (جدید ایڈیشن)	" ۱۰/-
اسلامی معاشرت	" ۴/-
قرآنی فیصلے (مکمل سیٹ) (جلد دوم-سوم-جدید ایڈیشن)	" ۲۵/-
جہاد	" ۲/۵۰
عربی خود سیکھئے (جدید ایڈیشن)	" ۱۰/-

نام کتاب	قیمت
پاکستان کا معمارِ اوّل	۳/۵۰ روپے
فجر الاسلام (جلد اوّل)	" ۵/-
فجر الاسلام (جلد دوم)	" ۵/-
منزل بہ منزل	" ۸/-
قتلِ مرتد	" ۲/-
عالمگیر افسانے	۱/- روپیہ
پرنسپل آف لا میکنگ ان اسلام	۳/- روپے
جمع القرآن	" ۳/-
تاریخ الامت (مکمل سیٹ) (آٹھ جلدیں)	" ۲۸/-
تصنیفات ڈاکٹر ودود صاحب:-	
PHENOMENA OF NATURE & QURAN	" ۵۰/-
CONSPIRACIES AGAINST QURAN	" ۴۰/-

ملنے کے پتے

(۱) ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ لاہور

(۲) مکتبۂ دین و دانش - چوک اردو بازار - لاہور

معراجِ انسانیت

سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیہ والسلام) خود قرآن کے آئینے میں۔ مفکرِ قرآن کا بلند پایہ شاہکار عقل و عشق، فکر و نظر، دل و دماغ کا حسین امتزاج اس سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے مقامِ محمودی اور انقلابِ محمدی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

حسنِ معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب، بڑی تقطیع، اعلیٰ درجہ کا سفید کاغذ۔ ضخامت پانسو صفحات۔ کتابت طباعت نورانی۔ جلد مضبوط اور دلکش۔ قیمت پینتالیس (۴۵/-) روپے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

(۱) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

ضروری اعلان

ادارۂ طلوعِ اسلام سے خط و کتابت و ترسیلِ منی آرڈر، رجسٹری، پوسٹل چیک، ڈرافٹ اور ان سے متعلقہ لفافوں پر پتہ صرف

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

(۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور)

لکھیں۔ کسی کا نام نہ لکھیں۔ کیونکہ اس سے بسا اوقات دقتیں پیش آجاتی ہیں۔ نوٹ فرمالیں۔

(ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام)

ضرورتِ رشتہ

ایک پاکستانی (M.B.B.S) ڈاکٹر عمر ۳۰ سال کے لئے ایک دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے جو ڈاکٹری کی تعلیم یافتہ ہو تو بہتر، ورنہ ایم۔ اے (M.A) ضرور ہو۔ اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے۔

(خط و کتابت بصیغۂ راز)

ع۔ ع

معرفت:۔ ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور